مولانا محمد علیؒ کے یورپ کے سفر

مولینا محمد علیؒ کے یورپ کے سفر

(خود اُن کے اپنے قلم سے)

مرتّبہ

پروفیسر محمد سرور جامعہ ملّیہ اسلامیہ دہلی

کتاب خانہ پنجاب لاہور

قیمت۔ عہ

طبع اوّل

دسمبر ۱۹۳۱ء

فہرست مضامین

مضمون | صفحہ

مضمون	صفحہ

محمد علیؒ مرحوم پہلی بار ۱۸۹۸ء میں یورپ گئے۔ ۱۹½ برس کی عمر تھی ابھی ابھی کالج سے نکلے تھے۔ سول سروس کے امتحان میں شرکت کا ارادہ تھا۔ اُس زمانہ میں یہ امتحان صرف انگلستان ہی میں ہوتے تھے اور کئی سال کی تیاری اور بہت خرچ کرنے کے بعد اس میں کامیابی کی اُمید ہوسکتی تھی محض بڑے بھائی مولانا شوکت علی کی غیر معمولی ہمت اور ایثار تھا۔ کہ محمد علیؒ اس کٹھن مہم پر روانہ ہوسکے۔

محمد علی اس مرتبہ ساڑھے تین برس کے قریب انگلستان میں رہے۔ زندگی کی دلچسپیوں کی ظاہر ہے۔ وہاں کوئی کمی نہ تھی اور مرحوم طبیعت کے زاہد مشرب بھی نہ تھے۔ جوانی اور تندرستی، حسن صورت اور حسن کلام، مزاج آتشیں۔ دل میں جذبات کا اک طوفان اور اس پر دیارِ حسن کی آب و ہوا اتنی سازگار، مگر عجیب بات یہ ہے کہ مرحوم کے خود اپنے الفاظ میں "کالج چھوڑا تو ولایت جانا ہوا۔ یہاں البتہ شاہدانِ ازلی کی کمی نہ تھی۔ مگر ذوق نظارہ جمال لاکھ سہی اور گرہ میں مال بھی ہی۔ تاہم طبیعت کا میلان خلافِ دستور عام زہد و تقویٰ کی طرف تھا۔" معلوم ہوتا ہے کہ طلب علم کے شوق کے سامنے دوسرے شوق دب گئے۔ اور ساڑھے تین سال کا یہ زمانہ جو طوفان نوح سے کم کیا ہوگا تحصیل علم کی سرگرمیوں میں صرف ہوا۔ اتفاق کہیے کہ اس کے باوجود محمد علی سول سروس کے امتحان میں ناکام رہے اور آخر گھر والوں کے اصرار پر وطن واپس لوٹے۔

۱۹۰۲ء میں دوبارہ انگلستان جانا ہوا۔ مقصد یہ تھا کہ آکسفورڈ میں اپنی تعلیم کو مکمل کریں، مرحوم کا زیادہ تر قیام آکسفورڈ میں رہا اور آخر میں نہایت امتیاز کے ساتھ بی۔اے آنرز کی سند لیکر آئے۔

ہندوستان آنے پر کچھ عرصہ تک ریاست بڑودہ میں ایک اعلےٰ عہدہ پر رہے۔ ریاست کی فضا محدود، نوکری کا معاملہ۔ مرحوم کی طبیعت ایک بے کراں سمندر۔ کڑھتے، بگڑتے، کبھی کبھی افسروں سے اُلجھ پڑتے۔ آخر کب تک ضبط ہوتا۔ نوکری چھوڑ دی، کلکتہ سے "کامریڈ" نکالا اور اسلامی ہند کی سیاست میں بڑے بڑوں سے ٹکر لینے لگے۔ حکومت ہند کے دفاتر کلکتہ سے دہلی آئے تو یہ بھی "کامریڈ" کو دہلی سے نکالنے لگے اور اس کے ساتھ ایک اُردو کا روزنامہ "ہمدرد" بھی جاری کردیا۔

ہندوستان کی اسلامی سیاست کا یہ طوفانی عہد تھا۔ نوجوان پود انگریزی حکومت کے جوئے کو ناقابلِ برداشت پا رہی تھی۔ بوڑھے سلامت روی پر مصر تھے۔ سیاسی مجالس اور اخبارات کا لہجہ بدل چکا تھا۔ تقریر و تحریر کی گرمی طبیعتوں کو اُبھار رہی تھی۔ انہی دنوں کانپور میں ایک مسجد کے معاملہ پر حکومت نے نہتے بے گناہ مسلمانوں پر گولی چلادی، بس پھر کیا تھا ملک میں ایک سرے سے لیکر دوسرے سرے تک کہرام مچ گیا۔

یہ ۱۹۱۳ء کا واقعہ ہے، مولٰنا چپ چپاتے ولایت روانہ ہوگئے۔ آپ کے ساتھ سید وزیر حسن تھے جو اُس وقت مسلم لیگ کے سیکرٹری تھے۔ سفر کی غرض یہ تھی کہ کانپور کے حادثہ سے مسلمانانِ ہند میں جو عام بیزاری اور ناراضگی پھیل چکی تھی۔ اُس سے برطانی حکومت کے اربابِ اقتدار کو باخبر کریں، اور نیز ترکوں کے ساتھ جو بے انصافی کی جارہی تھی اُسکے نتائج بد سے حکومت کو تنبیہ کریں۔ محمد علی نے اس سلسلہ میں برطانوی مدبروں سے ملاقاتیں کیں۔ عام جلسوں میں تقریریں بھی کیں۔ ایک ایک

کرکے برطانیہ کے بڑے بڑے آدمیوں سے ملے، لیکن سب نے سُنی ان سُنی کردی، اور محمد علی ایک حد تک ناکام واپس آئے۔

۱۹۲۰ء میں چوتھی بار یورپ جانے کا اتفاق ہوا۔ جنگ عظیم ختم ہو چکی تھی۔ ترکی سلطنت کے حصے بخرے کرکے انگریز اور اُن کے حلیف آپس میں بانٹ رہے تھے۔ خلیفۃ المسلمین اتحادی فوجوں کی حراست میں تھے۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے ان مظالم کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے ایک وفد انگلستان بھیجا۔ اور محمد علی اس وفد کے صدر بنائے گئے۔ یہ وفد تقریباً آٹھ مہینے تک یورپ میں رہا۔ محمد علی نے اپنی آواز سیاست اور حکومت کے بڑے بڑے ایوانوں میں پہنچائی۔ لیکن اتحادی غرورِ فتح میں سرمست تھے۔ ظاہر ہے شادی کے شادیانوں میں کسی بےکس ستم زدہ کی آہ دردناک کون سنتا ہے۔ محمد علی یورپ سے دِل شکستہ لوٹے اور یہ ٹھان کر لوٹے کہ آیندہ کبھی اس بارگاہ کی طرف سائل کی حیثیت سے رُخ نہ کرینگے۔

یورپ سے آئے آٹھ برس گذر گئے۔ اس اثنا میں ہندوستان میں کئی طوفان آئے۔ خلافت کی تحریک اُٹھی، پھیلی اور پھیل کر پھر سمٹنے لگی۔ ترکِ موالات کا بڑا ہنگامہ ہوا لیکن آخر یہ بھی سرد پڑ گیا، لیکن سب سے جانکاہ حادثہ یہ تھا کہ ہندو مسلمان ۱۹۲۰ء میں یک دل ایک جان ہو کر پھر آپس میں لڑنے لگے اور حالت یہاں تک پہنچی کہ کوئی شہر ایسا نہ بچا جہاں ہندو مسلم بلوے نہ ہوئے ہوں۔ محمد علی ایک شیر دِل قائد کی طرح ان سیاسی جھگڑوں کا مقابلہ کرتا رہا۔ شروع میں اُسکے ساتھ ایک جمّ غفیر تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ ساتھیوں کا یہ مجمع چھٹتا چلا گیا۔ وہ چلاتا تھا اور کوئی نہ سنتا تھا۔ مسلمان خفا تھے کہ وہ ہندوؤں کی پاسداری کرتا ہے۔ ہندو بیزار تھے کہ محمد علی ہمیشہ اسلام اور مسلمانوں کا نام الاپتا ہے۔ یہ اپنی دُھن کا پکا جو بات حق سمجھتا تھا بے۔ ورعایت برملا کہتا تھا۔ اور کسی کی پرواہ نہ کرتا تھا۔ آخر ہوا یہ کہ "ہمدرد" کے پڑھنے والے کم ہو

گئے، اور مالی اعتبار سے مرحوم سخت پریشان ہو گئے۔ صحت پہلے ہی کب اچھی تھی، ان تفکرات نے مدافعت کی قوت اور بھی کمزور کر دی، ذیابیطس کا زور ہوا، اور جان کے لالے پڑ گئے۔

جون ۱۹۲۸ء کا پانچواں سفر مرحوم کا سفرِ صحت تھا۔ نومبر تک یورپ میں قیام رہا۔ سیاسی مصروفیت کوئی تھی نہیں اس لئے یورپ کے شہروں میں خوب گھومے جاتے ہوئے ایک دن کے لئے قاہرہ گئے۔ چند دن پیرس میں ٹھہرے۔ لندن میں رہے۔ اور پھر جرمنی تشریف لے گئے۔ اور اس سیاحت اور علاج معالجہ سے بیماری کا زور کم تو ہوا لیکن واپس ہندوستان آ کر پھر سیاست کے بھنور میں پھنس گئے۔ اب کہ معرکہ بہت سخت تھا۔ اپنے بہت سے ساتھی حریف جماعت میں شامل تھے۔ محمد علی کو شکست دینا تو محال تھا لیکن مخالفتوں کا سیلاب ایسا نہ تھا کہ کسی کے تھامے تھمتا، صحت پھر گری اور ایسی گری کہ محمد علی چند دن کا مہمان سمجھا جانے لگا۔

۱۹۳۰ء میں گول میز کانفرنس کا لندن میں انعقاد ہوا۔ کانگرس بڑی سختی سے اس میں شرکت کے خلاف تھی۔ مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت بھی اس امر میں کانگرس سے متفق تھی۔ محمد علی شرکت کے حامی تھے دونوں فریق زور آزمائی پر تیار تھے۔ محمد علی نے اپنے ہم خیالوں کو سمیٹا، سنبھالا اور ابھارا اور مرتے مرتے ہر محاذ پر مخالفتوں کا مقابلہ کیا گو صحت جواب دے چکی تھی۔ آنکھوں کی بینائی تقریباً ناپید تھی، خون کا دباؤ ہر دم موت کو دستک دیتا تھا لیکن اس نازک حالت میں بھی وہ لندن روانہ ہو گئے۔

محمد علی کا یہ چھٹا اور آخری سفر یورپ ہے۔ یہ گول میز کانفرنس میں شرکت کی دعوت نہ تھی موت کی دعوت تھی جو کسی حیلے سے نہ ٹلی۔ دوستوں نے روکا، عزیزوں

نے سمجھایا۔ لیکن اُنہیں نہ ماننا تھا نہ مانے۔ بڑی مشکل سے جہاز پر سوار ہوئے۔ راستہ میں غش آتے گئے۔ پیرس پہنچے تو یکبارگی طبیعت نہایاں خراب ہو گئی، دوا دارو ہوا تو موت کے مریض نے سنبھالا لیا، اور مرحوم پیرس سے لندن چل دئے، گول میز کانفرنس ہوئی وہ اس میں شریک بھی ہوئے، تقریر بھی کی اور جو بات کہنی تھی سب کہی۔ اور جب موت کا فرشتہ آیا تو جان ہار محمد علی ہندو مسلم سمجھوتہ کے متعلق اپنے خیالات قلمبند کروا رہے تھے۔ اُن کے جی کو یہ بات لگی ہوئی تھی کہ کسی طرح ہندو مسلمانوں میں سمجھوتہ ہو جائے، اور سب مل جل کر متحدہ طور پر برطانیہ کے سامنے آزادی کا مطالبہ پیش کریں۔ آخر وقت تک وہ اس جدوجہد میں منہمک رہے۔ اُن کی ہمت اٹل تھی۔ اور اُن کا ایمان لازوال۔ ناممکن تھا کہ یہ شعلہ موت سے بجھ سکتا لیکن بدن پر موت کا دریں چل گیا۔ محمد علی کے عناصر بدن اُس کے ایمان اور اُس کی ہمت کا ساتھ نہ دے سکے، گو آخری لمحہ تک ہوش و حواس برقرار رہے لیکن دماغ کی خون کی رگیں پھٹ گئیں اور ۴ جنوری ۱۹۳۰ء کی رات کو محمد علی نے اپنی جان جان آفریں کو سونپی۔

إنا لله وإنا إليه راجعون

مرحوم چھ بار یورپ گئے اور جب کبھی بھی گئے، یورپ کو خوب آنکھیں کھول کر دیکھا۔ انہوں نے یورپ کی زندگی کے ہر پہلو کو ٹٹولا، سرود و رقص کی محفلوں میں بھی گئے اور علم و سیاست کی بارگاہوں میں بھی بار پایا۔ انگریزی زبان پر اتنا عبور حاصل کیا کہ اُن کے قلم و زبان دونوں کو جاہلوں سے لیکر عالموں، گنواروں سے لیکر شہریوں۔ فقیروں سے لیکر امیروں اور مزدوروں سے لیکر وزیروں تک کے الفاظ و عبارات، ادا کرنے پر یکساں کامل قدرت و مہارت تھی۔ ملاحوں کے سرود

اُنہیں یاد تھے، اناؤں کی لوریاں انہیں یاد تھیں۔ لیمرک (LAMERICK) اُنہیں یاد تھیں۔ لندن کے مشرقی حصّہ (EAST END) کے آوارہ گرد چھوکروں کی پھبتیاں انہیں یاد تھیں۔ بل (BULL) انہیں یاد تھے۔ معمے اور چیستاں انہیں یاد تھے۔ اس کے ساتھ انگریزی کے متقدمین، متوسطین اور متاخرین شعرا اور مصنفین کے بہترین علمی و ادبی جواہر پارے اُن کی زبان پر یا اُن کی نظر میں تھے۔ انجیل کی کتب عتیق و جدید پر اُن کی نگاہ تھی۔ سینکڑوں علمی لطیفے اُن کے نوک زبان تھے؛ لیکن محمد علی نے یورپ کی یہ گراں مایہ متاع اپنا کچھ کھو کر حاصل نہ کی تھی، وہ مشرقی تھے، اور اُن کی مشرقیت عصبیت تک پہنچی ہوئی تھی۔ انگریزی ادب پر عبور پانے سے قبل وہ اُردو کے شعرا کے شیفتہ رہ چکے تھے۔ غالب کا کلام اُن کا صبح و شام کا وظیفہ تھا۔ اور معلوم نہیں سینکڑوں بار ہر رنگ میں اُسکے اشعار سے حظ اٹھایا ہوگا، انجیل کی کتب عتیق و جدید پر بالضرور اُن کی نگاہ تھی لیکن جوانی سے مرض الموت تک اُن کا کوئی دن ایسا نہ گزرا ہوگا کہ انہوں نے آخری صحیفۂ الٰہی کو اُس کی اصلی زبان میں نہ پڑھا ہو۔ مانا کہ وہ انگریزی کے ممتاز صاحب قلم تھے لیکن اُردو کے بھی بلند پایہ ادیب اور شاعر تھے۔ ایسی ہمہ گیر شخصیت نے یورپ کو جس نظر سے دیکھا اور جو تاثرات اُس کے دل نے یورپ کی تہذیب سے لئے اُن کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔

مولانا نے یورپ کو بہت دیکھا تھا اور ظاہر ہے انہوں نے یورپ پر بہت لکھا بھی، اُن کے دل و دماغ پر جو کچھ گزرتا تھا وہ اُس کے اظہار کئے بغیر رہ نہیں سکتے تھے۔ یہ محسوسات کبھی تو موزوں الفاظ کی شکل میں یاد احباب کی بے تکلف صحبتوں کو گرماتے اور کبھی الفاظ کا لطیف جامہ پہن کر خطوط اور مضامین کی صورت میں جلوہ گر نظر آتے۔ آکسفورڈ اور لندن میں جب محمد علی طالب علمی کے دن گزار

رہے تھے تو اُن کے بڑے بڑے طویل مراسلے علی گڑھ منتھلی میں (OXFORD IDLING) کے عنوان سے کئی کئی نمبروں میں نکلتے رہے۔ ذکر اُن میں زیادہ تر کالج کے کھیل کود، ہم جولیوں کی رنگ رلیوں کا اور سب سے بڑھ کر کشتی رانی یا کشتی بانی کا ہوتا۔ ۱۹۱۳ء میں جب محمد علی تیسری بار یورپ گئے تو اپنا اخبار نکلتا تھا۔ آپ نے انگلستان سے بہت سے خط لکھے جو "کامریڈ" میں چھپتے رہے، چوتھی بار وفد خلافت کے سلسلہ میں گئے تو فرصت کم ملی اور کچھ زیادہ لکھ نہ سکے۔ پانچویں بار ۱۹۲۸ء میں علاج کے لئے یورپ جانا ہوا تو سیاسی مصروفیتیں بالکل نہ تھیں، علاج کے سلسلہ میں سیاحت کا کافی موقعہ ملا۔ اور اتنی فرصت بھی تھی کہ اپنے سفر کے حالات قلمبند کرتے جاتے، چنانچہ اس زمانہ میں مرحوم نے اپنے دوستوں اور عزیزوں کو بہت خط لکھے۔ یہ خط "ہمدرد" میں شائع ہوتے رہے۔

آخری مرتبہ ۱۹۳۰ء میں گول میز کانفرنس کی شرکت کے لئے تشریف لے گئے تو نہ "ہمدرد" تھا کہ اُس کے لئے کچھ لکھتے۔ بیگم صاحبہ، مولینا شوکت علی اور چھوٹی صاحبزادی سفر میں ساتھ تھے۔ بڑی صاحبزادی ہندوستان میں رہی اُن کو کئی ایک خط لکھے ہیں۔ آخری خط تو انتقال سے صرف ایک ہفتہ پہلے کا ہے۔ اس زمانہ میں مولینا بستر مرض نہیں بلکہ بستر مرگ پر تھے۔ ڈاکٹروں نے لکھنے پڑھنے کی سخت ممانعت کر دی تھی اور ہر وقت اُن پر نرسوں کا پہرہ رہتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ برابر ہندوستان میں اپنے دوستوں کو گول میز کانفرنس کے حالات لکھتے رہے۔

مولینا کا سارا سرمایہ ادب تو کسی طرح سمیٹے سمٹ نہیں سکتا۔ اگر صرف اُن کے مضامین کا ذخیرہ جمع ہو تو کئی جلدوں میں سمائے۔ تقریروں کا پھیلاؤ تو اتنا ہے کہ کسی طرح احاطہ میں نہیں آسکتا۔ خطوط کمیاب ہیں۔ لیکن سب دستیاب ہوں تو اُن کی اشاعت بھی مشکل ہو جائے۔ یورپ کے اپنے چھ سفروں پر مرحوم نے 'انگریزی

اور اردو میں بہت کچھ لکھا انگریزی مضامین کی ترتیب اور اُن کی اشاعت اس وقت مقصود نہیں اُردو میں جو کچھ مل سکا۔ وہ ناظرین کرام کی خدمت میں حاضر ہے جامعہ کے کتب خدنے میں مولینا مرحوم کے "باقیات صالحات" کا جو بھی اثاثہ موجود ہے۔اُسی سے استفادہ کیا گیا ہے۔

زیرِ نظر کتاب میں وہ تاثرات ہیں جو آپ نے یورپ کے پانچویں سفر کے ہیں۔ یہ سفر جیسا کہ معلوم ہے علاج کے سلسلہ میں کیا گیا تھا۔ مرحوم ۲ رجون ۱۹۲۸ء کو ساحل ہند سے رخصت ہوئے تھے، گو صحت معمولاً خراب رہی اور کبھی کبھی لندن اور فرالکفرٹ (جرمنی) میں صاحب فراش بھی رہے لیکن وہ اس حالت میں کچھ نہ کچھ لکھتے ہی رہے۔

کہیں جہاز کے ہمراہان سفر کا تعارف ہے قاھرہ میں مصری احباب سے ملاقات ہوتی ہے۔ تو مصر کی سیاسی تاریخ پر تبصرہ کرتے جاتے ہیں، ساتھیوں کے انبوہ در انبوہ میں اپنے آپ کو تنہا پاتے ہیں تو اہل وطن کی بے مہربانیاں یاد پڑتی ہے اور مرحوم کے قلم سے خونِ دل کے قطرے ٹپکے پڑتے ہیں۔ لندن پہنچتے ہیں تو برطانی پارلیمنٹ کے جلسوں میں جاتے ہیں بعض سیاسی مجالس میں خاموش تماشبین کی حیثیت میں شریک ہوتے ہیں تو ہندوستان کی غلامی اور اپنی بیکسی اور بے بسی ستاتی ہے اور تحریک ترک موالات کا عہد شباب یاد آجاتا ہے۔ اور مرحوم کے دل میں اِک ہوک سی اُٹھتی ہے اور وہ اپنا درد سنائے بغیر نہیں رہتے کہیں رنگین مناظر دیکھتے ہیں تو اُن کی بھی تصویر کھینچتے ہیں، اس وقت ان کا قلم وہ وہ گلکاریاں کرتا ہے کہ آنکھوں کے سامنے تمام نقشہ پھر جاتا ہے، اس بیان میں شوخی ہے، ظرافت ہے، اور لطیف طنز بھی، ہر بات صاف صاف کہہ جاتے ہیں، دل پر جو کچھ گذرتی ہے اُس کو کہتے میں ذرا حجاب نہیں۔ یہ صاف گوئی اُن کی تحریر کا خاص جوہر ہے ذرا بھی خیال نہیں کہ تنگ نظر اور ظاہر فریب اہل وطن کیا کہینگے

مرحوم کی رائے میں اگر کسی چیز کو دیکھنے میں باک نہیں تو اس کے بیان میں کیوں جھجک ہو، بہر حال جو کچھ دیکھا لکھ دیا۔ جو محسوس کیا بیان کر دیا۔ لکھنے کا ڈھنگ دلآویز، الفاظ موزوں، برجستہ فقرے، کہیں کہیں اشعار کی چاشنی۔ بہر حال یہ سفرنامہ ادب اردو کا ایک مرقعہ ہے کہ اس میں جو بھی تصویر ہے وہ خوش رنگ اور حسین، اور مصور محض رنگوں اور خطوں کا بادشاہ نہیں بلکہ صاحب دل ہے، طبیعت میں سوز ہے، گداز ہے، وارفتگی ہے اور اس کے علاوہ طبیعت کو ادب سے خاص لگاؤ ہے۔ اور آرٹ اور حسن سے شیفتگی

چھٹے سفر کے سلسلہ میں صرف چند خطوط ہیں جو مرحوم نے اپنی صاحبزادی کو لکھے ان میں گول میز کانفرنس کے حالات ہیں یا اپنی صحت اور بیماری کا ذکر۔ آخر میں ہم نے مولانا شوکت علی مرحوم کا ایک خط نقل کر دیا ہے جس میں مولینا محمد علی کی زندگی کی "آخری شب" کے حالات ہیں۔

پہلے دو سفروں کے متعلق کچھ نہ مل سکا۔ تیسرے سفر کے حالات اس وقت "کامریڈ" اور "ہمدرد" میں چھپتے تھے، اس کا محض ایک خاکہ کتاب میں شامل ہے، یہ انگریزی میں لکھے ہوئے مضامین میں اصل انگریزی میں چھپیں تو بات ہے، ترجمہ میں مرحوم کا انداز بیان کہاں، وفد خلافت کے حالات سفر بھی اُن کے قلم کے لکھے ہوئے نہ ملے۔

مرحوم نے پانچویں سفر کے حالات میں کہیں کہیں پہلے سفروں کا بھی ذکر فرمایا ہے مرتب نے اس میں سے بعض جستہ جستہ عبارتیں لے لی ہیں گو یہ بیان نامکمل ہی، بہر حال نہ ہونے سے تو بہتر ہے۔ امید ہے زیر نظر مجموعہ شوق سے پڑھا جائے گا۔

آخر میں اپنے محترم بزرگ اور مرحوم کے "یار غار" مولینا عبدالماجد صاحب دریابادی قبلہ کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ مولینا محمد علی کے مضامین، خطوط اور

اور اس مجموعہ کی ترتیب میں موصوف کے اشارات اور اُن کے مضامین سے بہت مدد ملی۔ واقعہ یہ ہے کہ مولینا عبدالماجد صاحب کی سعی مشکور کا ہی یہ نتیجہ ہے کہ خاکسار یہ سب کچھ کر سکا۔

محمد سرور
جامعہ ملیہ دہلی

پہلا اور دوسرا سفر ۱۸۹۸ء و ۱۹۰۲ء

زمانہ طالب علمی

(۱)

ڈیڑھ بجے ہم ہندوستان کے ساحل سے رخصت ہوئے (۲۱ر جون ۱۹۲۸ء) کیا کہوں کہ کن افکار اور کن خیالات کا اس وقت دل میں اور دماغ میں ہجوم تھا۔ پہلا سفر ۱۸۹۸ء کا کن امنگوں اور کن امیدوں کے ساتھ شروع ہوا تھا۔ ایک غریب بھائی کی بے نظیر اور حیرت انگیز ہمت کی بدولت یکایک آکسفورڈ جانے کا انتظام ہوا تھا۔ پیسہ عنقا کا حکم رکھتا تھا۔ سول سروس میں کامیابی کی آرزو تھی۔

دوسرا سفر ۱۹۰۲ء میں ہوا تھا جب کہ سول سروس میں ناکام رہ چکا تھا۔ شوکت صاحب بھی ناکامی کی خبر "پایونیر" میں پڑھ کر زرد پڑ گئے تھے مگر ایک بڑھیا نے دیکھتے ہی تاڑ لیا تھا کہ کیا ہوا اور پوچھا تھا کہ کیا محمد علی کی امتحان میں ناکامی ہی پر اس قدر مایوس ہوتے ہو، اگر اس نے چوری کی ہوتی، یا مرتد ہو گیا ہوتا تب تمہاری کیا حالت ہوتی، محمد علی کو لکھو کہ میرا اسے دیکھنے کو جی چاہتا ہے اور اسکی منگیتر بھی تین ساڑھے تین برس سے بیٹھی ہے۔ اب اسے بلا لو اور اس کی شادی کر دو۔ میں بلا لیا گیا تھا۔ شادی بھی ہوئی تھی، رام پور میں محکمہ تعلیم کا افسر بھی مقرر ہو چکا تھا۔ اور اب صرف آکسفورڈ کا بی۔ اے کا امتحان دینے جا رہا تھا۔ رام پور میں جو واقعات گذر چکے تھے وہ بعید پریشان کن اور بالآخر میرے استعفیٰ کا پیش خیمہ تھے، نہیں کہہ سکتا تھا کہ کیا حشر ہوگا، جو حشر

ہوا، وہ آپ کو معلوم ہے۔

(ایک خط مؤرخہ ۶ رجون ۱۹۲۵ء)

(۲)

علی گڈھ کالج میں شاعری تو کچھ کی مگر وہی فرضی عشق۔ اگر کچھ اصلیت تھی بھی تو اُتنی ہی جتنی ایران کی شاعری کو اور "سبزہ خط" وغیرہ کو ایک حد تک بامعنی کر دیتی ہے۔ کالج چھوڑا تو ولایت جانا ہوا۔ یہاں البتہ شاہدانِ اصلی کی کمی نہ تھی۔ مگر ذوقِ نظارہ جمال لاکھ سہی اور گرہ میں مال بھی سہی تاہم طبیعت کا میلان خلافِ دستور عام زہد و تقوی کی طرف تھا۔ دو برس کے قریب تو ہندوستان کے کچے دھاگے نے باندھے رکھا (انگلستان جانے سے پہلے مولینا کی شادی کر دی گئی تھی) دو برس کسی اور کے خیال نہیں مگر یہ آخری خیال باعصمت تھا اور محض حالاتِ گرد و پیش اس کے محرک تھے۔

(مولینا عبد الماجد صاحب کے نام ایک خط)

تیسرا سفر ۱۹۱۳ء

برطانیہ کی مسلم آزار حکمت عملی کیخلاف احتجاج

"تیسرا سفر، سید وزیر حسن صاحب کی معیت میں ۱۹۱۳ء میں چھپ چھپا کر ہؤا تھا کہیں میرے کرم فرما میسٹن صاحب (گورنر صوبجات متحدہ) جن سے دو ہفتے پیشتر ہم سدھار رہے تھے، سنتے ہی میری گرفتاری کا وارنٹ نہ نکال دیں۔ "ایم۔ علی" اور "ڈبلیو حسن" کے نام کے دہلی سے ٹکٹ خریدے گئے تھے۔ سورج نکلنے سے پیشتر شوکت صاحب کے ساتھ دہلی کے اسٹیشن سے عید الفطر کے دوسرے دن اس طرح روانہ ہؤا تھا کہ گویا شوکت صاحب کو صرف پہنچانے آیا ہوں، گھر میں نہ بچیوں کو خبر تھی نہ نوکروں کو اور سامان بھی یہ کہکر بندھوایا تھا کہ شملے جا رہا ہوں۔ وہاں سردی پڑتی ہے۔ گرم کپڑے زیادہ رکھنا۔ کانپور کی مسجد شہید ہو چکی تھی۔ سو سے زیادہ مسلمان، جن میں بوڑھے بھی تھے اور بچے بھی، اس وقت قید تھے۔ ایڈریانوپل کے فاتح ترکوں سے اسکوتھ صاحب (برطانی وزیر اعظم) اور سرایڈورڈ گرے (برطانی وزیر خارجہ) سختی کے ساتھ مطالبہ فرما رہے تھے۔ "کامریڈ" کے ایڈیٹر نے پریس ایکٹ کے خلاف ایک بے نظیر فیصلہ سرلارنس جینکنس کلکتہ ہائیکورٹ کے چیف جسٹس اور دوسرے سینئر ججوں کا حاصل کر لیا تھا۔ گو "مقدونیہ آؤ" اور "ہماری مدد کرو" والا پمفلٹ، جس میں بلقانی حلیفوں کے مظالم کی داستان غم نصاریٰ ہی کو سنائی گئی تھی، پھر بھی واپس نہ مل سکا تھا۔ انگلستان کی لبرل حکومت کے پاس جا کر منت سماجت کرنا تھی۔ اس کا بھی جو حشر ہؤا وہ آپ کو معلوم ہے۔"

(ایک خط مؤرخہ جون ۱۹۲۸ء)

(۱)

یکایک روانگی

وفد کا بیان

"ایسے اہم اور دُور رس اثر واقعات گزشتہ، دو تین سال کے اندر ہندوستان اور بیرونی ہندوستان میں جلد جلد واقع ہوتے رہے ہیں جن کا اثر مسلمانوں پر بہت گہرا ہے۔ ہمارے دوستوں کے اور نیز ہمارے نزدیک یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے نقطۂ خیال کو صحت کے ساتھ سمجھنا گورنمنٹ اور خود مسلمانوں کے مفاد کے لحاظ سے نہایت ضروری ہے۔ ہمارے دوستوں نے ہم کو مشورہ دیا ہے۔ اور ہم ان کے ساتھ اس بارے میں متفق ہیں کہ موجودہ نازک موقعہ پر ہمارا انگلستان جانا نہایت ضروری ہے۔ تاکہ ہند کے مسلمانوں کے صحیح نقطہ خیال کو اور ہندوستان و نیز دیگر ممالک کے مسلمانوں کے سچی حالات کے اہم پہلوؤں کو اخباروں اور دوسرے مناسب ذرائع سے ملک معظم کے وزرا، پارلیمنٹ کے ممبروں اور دُوسرے با اثر لوگوں اور کل انگریزی قوم کو بالعموم واقف کریں اور حضور ملک معظم کی ذات و تخت کے ساتھ مسلمانوں کی وفاداری کی اہمیت اور ان کے مطالبات کی حق بجانب ہونے کا یقین دلائیں۔ ہمارے دو ہم مذہب یعنی خواجہ کمال الدین صاحب اور مسٹر محمد علی جناح بالفعل ولایت میں موجود ہیں اور ہم کو ان سے سچی امداد کی امید ہے۔ ہز ہائنس سر آغا خاں بھی یورپ میں ہیں اور ہم کو ان سے ہر قسم کی دلجوئی اور مدد کی توقع ہے۔ لیکن ہماری روانگی کی غرض کسی ایک فرقہ یا قوم ہی سے وابستہ نہیں ہے۔ ہمارا پختہ یقین ہے کہ مسلمانو کی ترقی اور خوش حالی اس ملک کی خوش حالی اور ترقی کے ساتھ وابستہ ہے۔ جس میں وہ رہتے ہیں۔ زمانہ موجودہ کے بطن میں ہندوستان کے ہر طبقہ کے لئے امید و بیم

دونوں پوشیدہ ہیں اور نہ صرف بحیثیت ہندوستانی ہونے کے بلکہ بحیثیت مسلمان ہونے کے بھی ہم اپنا فرض ادا کرنے سے قاصر رہینگے، اگر ہم اپنے زمانۂ قیام میں خطرات کو امیدوں سے نہ مبدل کر سکے، اور ان امیدوں کو مستحکم نہ کر سکے جن میں ہم اور ہمارے ہم وطن مشترک ہیں۔

آنریبل مسٹر گوکھلے بھی اس وقت ولایت میں ہیں اور ہم کو ان کی ہمدردی اور اعانت بھی حاصل ہونے کی امید ہے۔ یہ ہے ہمارا مقصد جس کے لئے ہم آج اس کی اہمیت، نفع اور اپنی ذمہ داریوں کو سمجھ کر روانہ ہو رہے ہیں۔ اور ساتھ ہی ہم کو اپنے مطالبہ کے حق ہونے پر اور انگریزی قوم کی قابلیت اور انصاف پسندی پر بھروسہ اور امید بھی ہے۔ وقت کا ہم کو بہت خیال تھا اور مجبوراً ہم کو یکایک روانہ ہونا پڑا۔ درحقیقت ایک ہفتہ سے کم کے اندر ہم کو سامان سفر درست کرنا اور بمبئی پہنچ جانا پڑا۔ اور اپنی قوم کو بھی ہم پہلے سے اپنے ارادہ سے نہ مطلع کر سکے۔ لیکن ہم کو اعتماد کلی ہے کہ ہمارا کام خود ہماری قوم سے سفارش کریگا۔ اور ہم کو ان کا اعتبار حاصل ہوگا۔ ہم بہ کمال عجز ان سے درخواست کرتے ہیں کہ روزمرہ کی نمازوں اور دعاؤں میں وہ ہم کو یاد کرینگے اور اگر خدا نے چاہا تو جس طرح پُر از امید ہم ان کو چھوڑ کر جاتے ہیں اسی طرح کامیاب ان سے آکر ملینگے انشاء اللہ تعالےٰ

(از ہمدرد ۲ ستمبر ۱۹۱۳ء) ایسوسی ایٹڈ پریس تار

(۲)

عثمانی تارپیڈو کروزر

بندرگاہ سویز میں

ہم ابھی مارسیلز پہنچے ہیں۔ سویز پر اُترنے کے بعد ہمیں معلوم ہوا کہ جہاز حمیدیہ تین ہفتہ ہوئے، وہاں سے چلا گیا ہے۔ ہم نے ایک چھوٹے سے بوسیدہ اطالوی ہوٹل میں کھانا کھایا اور پھر عثمانی تارپیڈو کروزر "پیک شوکت" کو دیکھنے کے لئے چلے گئے، جو اطالوی حملے سے پیشتر مرمت کے لئے یہاں آیا تھا۔ اور اس وقت سے لے کر اب تک یہیں لنگرانداز تھا۔ غالباً وہ جنگ طرابلس کے وقت ترکی سمندروں سے بہت دُور تھا۔ اور اس لئے یہ ضروری سمجھا گیا کہ اسے ہر قسم کے نقصان سے بچانے کے لئے سویز ہی میں رکھنا زیادہ مناسب ہے۔ محمد قُطلی کمانڈر ویسے ہی بااخلاق اور متواضع نکلے جیسا کہ ہمارے مشن کے بیانات سے معلوم ہوتا تھا۔ اُنہوں نے ہماری خاطر بہت تکلیف اُٹھائی۔ اور ہم سے بہت اخلاق سے پیش آئے۔ اس لئے میں یہ ضرور کہونگا کہ کم سے کم جہاں تک عادات و اخلاق کا تعلق ہے، دنیا کی کوئی قوم ان سے سبقت نہیں لے جاسکتی۔ ہم نے تمام کروزر کی سیر کی۔ توپوں کو دیکھا۔ اور اس امر کا بھی مشاہدہ کیا کہ وہ کس طرح سے چلتی ہیں۔ تارپیڈو کشتیاں بھی دیکھیں اور اس مشین کا بھی معائنہ کیا جس کے ذریعہ سے اس میں ہوا پہنچا کر انہیں کام کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔ ہم نے تمام افسروں کے بنگلے بھی دیکھے اور تقریباً دو گھنٹے تک کشتی ہی میں قیام کیا۔

ہم پھر ساحل کی طرف واپس چلے گئے اور بڑی وقت کے بعد ملاحوں نے جو جہاز سے ہم آٹھ اشخاص کو بٹھا کر ساحل تک لائے تھے، نصف اشرفی کی اجرت

پر ہمیں جہاز تک لے جانا منظور کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے رہنما نے اس رقم کو کشتی میں پھینک دیا اس لئے کہ ملاحوں نے اس کے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ سویز عملی طور پر ایک یوروپین ڈاک گھر ہے۔ کیونکہ ایک تہائی آبادی (جس کا کل اندازہ ۲۰ ہزار ہے) یوروپین ہے۔ لیکن یورپ کی برائیاں بھی آبادی کے ساتھ ساتھ وہاں داخل ہو گئیں اور سب سے زیادہ افسوس اس امر کا ہے کہ مصریوں کے بھی اخلاق بہت بگڑ گئے ہیں۔ اس لئے کہ ہم نے ایک دو خاموش بازاروں میں ایک دو عورتوں کو برقعہ میں دیکھا جو ہاتھوں اور انگلیوں میں زیور پہنی ہوئی تھیں۔ اُن کے بوٹوں کی ایڑیاں بہت اونچی تھیں۔ اور وہ ایسی مشتبہ نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہی تھیں جس طرح سے کہ یوروپین بازاروں میں سفید پوش عورتیں جن مردوں کو دیکھتی ہیں ان پر حملہ کر دیتی ہیں۔ تقریباً چھ بجے ہم قاہرہ سے ایک غلام گردش گاڑی میں بیٹھ کر رخصت ہو گئے۔ ہمارے ساتھ چند مصری مسافر بھی تھے جن سے ہم گفتگو کرتے رہے۔ قدرتی طور پر مشن کے متعلق ہی گفتگو ہوئی اور ہم نے انہیں اپنے البم میں مشن کی تصویریں دکھائیں لیکن اسمٰعیلیہ میں وہ ہم سے رخصت ہو گئے کیونکہ انہیں پورٹ سعید جانا تھا۔ اور قاہرہ جانے کے لئے ہم کو بھی ایک تیز چلنے والی اور آرام دہ ٹرین مل گئی۔ کھانے کی گاڑی اعلیٰ درجے کی تھی اور اگرچہ کھانے کے لئے ہمیں نو روپے بارہ آنے فی کس دینے پڑے۔ تاہم وہ ہمارے ہندوستانی گاڑیوں کے کھانے سے بدرجہا اچھا تھا۔ رات کے گیارہ بجے ہم قاہرہ پہنچ گئے۔ اس کا حال میں آئندہ چھٹی میں سناؤنگا کیونکہ کل پرسوں یہاں یا پیرس میں مجھے اس کے لکھنے کے لئے کافی وقت مل جائیگا۔ ہم یہاں کے نظارے دیکھنے کے بعد رات کے آٹھ بجکر دس منٹ پر پیرس روانہ ہو جائینگے اور وہاں تقریباً تین دن تک قیام کرینگے۔ ہمیں وہاں جا دینے اور عثمانی سفیر سے ملنے کی پوری توقع ہے۔" (ہمدرد ۲۲ اکتوبر ۱۹۱۳ء)

(۳)

خواجہ کمال الدین اور مسٹر جناح سے ملاقات

لندن۔

مجھے دوبارہ معافی مانگتے ہوئے شرم آتی ہے کہ اس ہفتہ بھی ایک مختصر سی چھٹی کے علاوہ "کامریڈ" کے لئے کوئی مضمون نہ بھیج سکا۔ میں نے جمعرات کے دن خط اور مضمون لکھنے کا بندوبست کر لیا تھا، مگر اس خیال سے کہ ہوٹل میں تخلیہ کی جگہ ملنی ناممکن ہے اور یہ کہ میں اور مسٹر وزیر حسن ایک چھوٹے سے کمرہ میں ۱۵ روپے روزانہ فی کس کے حساب سے رہتے ہیں۔ ہم نے نقل مکان کرنے کا فوراً ارادہ کر لیا چنانچہ بدھ کی شام کو ہم نے ایک اور ہوٹل میں علیحدہ کمرہ لے لیا۔ جمعرات کا آدھا دن خواجہ کمال الدین اور دیگر مسلمانوں سے ملاقات کرنے میں صرف ہو گیا۔ خواجہ صاحب موصوف نے بے ضرورت ہمارے واسطے لنچ کا بندوبست کیا اور اس طرح سے ہمارے بیش قیمت وقت کا بہت سا حصہ ضائع ہو گیا۔ دوسرے لوگ بھی بہت دیر سے آئے یعنی ٹھیک اس وقت جب کہ ہم نماز پڑھنے کے بعد واپس جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ گیارہ بجے کی بجائے تین بجکر بیس منٹ پر ہم نے مسٹر جناح سے ملاقات کی اور میں ابھی ان سے مل کر واپس آرہا ہوں۔ مسٹر وزیر حسن اب مسٹر امیر علی کے پاس گئے ہوئے ہیں۔ بدقسمتی سے پارلیمنٹ کا اجلاس فروری میں ہوگا، اور اس لئے کوئی بھی لندن میں موجود نہیں ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ممبروں میں سے صرف چند ہی اشخاص انگلستان میں ہیں تاہم ہم نے اپنا کام شروع کر دیا ہے۔ میں نے مسٹر شاہد سہروردی سے درخواست کی ہے کہ

وہ "ہیومنٹے[1]" کی ملاقات کے حال کا فرانسیسی سے ترجمہ کر کے آپ کو "کامریڈ" کے لئے بھیج دیں اور اصلی مضمون بھی ساتھ ہی نتھی کر دیں۔ میری ملاقات کا حال اُس نے ٹھیک طور پر درج نہیں کیا۔ میں نے اس قسم کی کوئی بات نہیں کہی تھی جس سے کہ یہ معلوم ہو کہ ہمیں ہندوؤں سے حسد ہے۔ بظاہر موسیو لونگیٹ نے اس ملاقات کا حال بہت جلد لکھ دیا۔ اس وجہ سے اس میں غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں۔ مسٹر رامزے میکڈانلڈ[2] ۶ تاریخ کو لندن آئینگے۔ اور وہ اور مسٹر جناح یہاں ہمارے ساتھ کھانا کھائیں گے۔ سر ہنری کاٹن اور اُن کے ۱۰ جزادے آج ہمارے پاس آئے اور ہمارا وقت بہت تفریح میں گذرا۔ مسٹر کلف (سابق ایڈیٹر اسٹیٹمین) نے اگلے ہفتہ مانچسٹر گارڈین کے ایڈیٹر سے ملاقات کرانے کا انتظام کیا ہے۔ لارڈ لیمنگٹن ۱۱ ماہ حال کو واپس آئینگے۔ آئندہ ہفتہ میں اخبارات کے لئے مضامین لکھنے میں صرف کروں گا۔

(ہمدرد ۲۴ اکتوبر ۱۹۱۳ء)

---

[1] ایک فرانسیسی رسالہ۔ [2] مزدور پارٹی کے لیڈر جو بعد میں وزیر اعظم بنے۔

(۴)

انگلستان میں وفد کی سرگرمیاں

مسٹر جناح، مسٹر امیر علی، سی کرشنا گپتا اور مسٹر عباس علی بیگ اور دیگر ہمدرد اور جلیل القدر انگریزوں سے ملاقات ہوئی سب کا خیال ہے کہ پولیس اس قدر آدمیوں کو بیدردی کے ساتھ ہلاک و مجروح نہ کر سکتی تھی بعض سر جیمس میسٹن کی نیک نیتی اور دانشمندی اور تدبیر پر بہت نازاں ہیں اور افتتاح پارلیمنٹ سے قبل کسی تصفیہ کی امید نہیں رکھتے۔ بعض مسلمانوں کے ہمخیال ہیں۔ چند مہتمم بالشان اخبارات کے متعلقین اور اعلیٰ حلقوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مسجد کے متعلق غلطی ضرور ہوئی ہے۔ لیکن اس کی اصلاح اس طور پر کرنی چاہیئے کہ گورنمنٹ کی آن باقی رہے، منشا یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ علماء کی ایک جماعت سے تحقیقات کرائی جائے، اور جب علماء شہید شدہ حصّہ کو مسجد کا اصل جزو قرار دیں تو مسجد کو اصل حالت پر بنوا دیا جائے، مگر اس طرح کہ حکام کی بات بھی بنی رہے اور مسلمانوں کی شکایت بھی رفع ہو جائے مسلمان گورنمنٹ اور افسروں پر کوئی مقدمہ دیوانی یا فوجداری نہ کریں۔ اور ..... باہمی مصالحت ہو جائے۔ ایسے ذی رتبہ اصحاب جو سر جیمس میسٹن سے کسی صورت میں کم نہیں ہیں، پولیس کی آتش باری کو ناواجب قرار دیتے ہیں۔

ہندوستان اور عمائدین انگلستان

متعدد کئی سال سے ہندوستانی جذبات و محسوسات کے خلاف اعلیٰ طبقوں میں تحریک پھیلائی جا رہی ہے۔ اس لئے کسی مسئلہ میں یہاں کے مقتدر اصحاب کو

ہم خیال اور ورد مند بنانا کسی قدر مشکل بن گیا ہے، ممبران پارلیمنٹ جو چھ ماہ کام کرتے اور چھ ماہ تعطیل مناتے ہیں، اور اس خدمت کے عوض میں چھ ہزار روپیہ سالانہ کی اجرت پر اپنے ملک کی نیابت کرتے ہیں ہندوستانی امور سے کم واقفیت رکھتے ہیں ہندوستان کو اپنی حکمران قوم کے دل میں جگہ کرنے کی کوئی صورت نہیں، مگر ایک اور صرف ایک، وہ یہ ہے کہ ایثار نفس، ذی مقدرت، قابل اور اہل لڑائے اصحاب اچھی خاصی تعداد میں آکر ہر سال ۳، ۴ ماہ لندن میں رہا کریں۔ اور عام انگریزی رائے کو اپنے خیالات و محسوسات سے آگاہ کریں، اور اپنا دردمند بنائیں۔ ہندو برادران اس ذیل میں کچھ کر رہے ہیں، مگر وہ بھی ناکافی ہے۔ لیکن مسلمان اس سلسلہ میں بالکل غافل ہیں، اور اُن کو کوئی اُمید بہتری کی نہ رکھنی چاہیئے۔ جب تک کہ وہ وطن سے باہر قدم رکھ کر ان لوگوں کے دلوں پر ہند کا سکہ نہ بٹھائیں گے، جو اپنے وطن سے باہر نکل کر ہم پر حکومت کر رہے ہیں +

پریس ایکٹ یا قانون مطابع

پریس ایکٹ کے متعلق مشہور و مستند قانون دانوں سے گفتگو آئی۔ اکثر اس قانون کو ناپسند کرتے ہیں اور اُن کی رائے ہے کہ اس میں ضرور ترمیم ہونی چاہیئے۔ بعض کا خیال ہے کہ اس کی منسوخی ہی میں چارہ کار ہے۔ بہر نوع بعض جلیل القدر اصحاب نے جو کھلم کھلا اس کام میں حصہ نہیں لے سکتے، وعدہ کیا ہے کہ وہ صاحب وزیر ہند کو بزور لکھیں گے اور اکثر موجودہ ذی اثر ہندوستانی لارڈ کریو کی خدمت میں اس کے متعلق ایک ڈیپوٹیشن لے جائیں گے +

مسلم یونیورسٹی۔

مسلم یونیورسٹی کے متعلق سرکاری و غیر سرکاری حلقہ میں گفتگو ہوئی، سرکاری حلقہ مسئلہ الحاق کے مخالف تھا۔ مگر سید وزیر حسن اور مسٹر محمد علی کی تقریروں سے

وہ متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ ان کو اکثر ایسے نقائص کا پتہ چل گیا ہے جن سے وہ بے خبر تھے، اور جو انکار الحاق میں مضمر ہیں۔

مسلمانانِ ہند اور ممالک اسلامی۔

مسلمانوں کے مذہبی محسوسات متعلقہ حالت ابنائے اسلام پر بعض ایسے اصحاب سے گفتگو آئی جو اپنی رائے کو پبلک کی رائے بنا سکتے ہیں، لیکن ابھی کوئی خاص صورت پیدا نہیں ہوئی۔

آئندہ پروگرام۔

اس وقت جملہ معاملات بہت آہستگی کے ساتھ گامزن ہیں اس کی زیادہ تر وجہ یہ ہے کہ ان ایام میں پارلیمنٹ چھٹیاں مناتی ہے اور اعلیٰ طبقہ کے قریب قریب جملہ اراکین لندن میں نہیں ہیں۔ اس لئے جب پارلیمنٹ بسر ونفریح سے سیر ہو کر فروری میں کام کرنے لگیگی اس وقت تبادلۂ خیالات ہو سکتا ہے، اور کامیابی کی صورت نظر آئے گی۔ بہرکیف اس وقت ہر دو صاحبان ملنے جلنے، بات چیت کرنے اور اپنی مجوزہ عمارت کی بنیادیں ڈالنے میں رات دن مصروف رہتے ہیں۔ بہت سے امور ایسے ہیں جن کا اظہار سرِدست نامناسب ہے۔ ہم صرف قوم کو اتنا یقین دلا سکتے ہیں کہ قوم کے دو مسلمہ خدمت گذار اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

(ہمدرد ۱۳ر اکتوبر ۱۹۱۳ء)

---

(۵)

برطانی وزراء کا ملنے سے انکار

لندن ۱۳ر نومبر

مسٹر محمد علی نے سر جیمس لاؤتش کو ایک تحریر بھیجی جس میں انہوں نے اس بات کا یقین دلایا کہ اُن کی اور وزیر حسن کی آمد صرف مسئلہ کانپور سے متعلق نہیں ہے۔ بلکہ اور بہت سے معاملات سے بھی متعلق ہے، جن میں مسلمانان ہند دلچسپی رکھتے ہیں اور سر جیمس سے درخواست کی کہ اُن کی طرف سے لارڈ کریو[1] کو ملاقات کا پیغام دیں۔ سر ولیم ہولڈرس نے مسٹر محمد علی اور مسٹر وزیر حسن کو لکھا کہ کافی غور کرنے کے بعد لارڈ کریو اس درخواست کی تعمیل سے معذور ہیں۔ لارڈ کریو کوئی پبلک فائدہ اس ملاقات کا نہیں سمجھتے۔ بلکہ یہ بات یقینی ہے کہ اُن کے اس فعل سے آپ کے ان ہم مذہبوں میں غلط فہمی پیدا ہوگی جن سے آپ متفق نہیں ہیں، اور جو مسلمانوں کی سیاسی حیثیت کی نمایندگی کا اتنا ہی دعویٰ کر سکتے ہیں جتنا کہ آپ ہندوستان کے مسلمانوں کے جذبات اور خواہشات ہز میجسٹی کی گورنمنٹ کے خیال اور ہمدردی کے مستحق ہیں اور لارڈ کریو ان معاملات پر کافی توجہ رکھتے ہیں اور مستند ذرائع سے واقعات کو معلوم کرتے رہتے ہیں۔

مسٹر محمد علی اور مسٹر وزیر حسن نے زیادہ تفصیل کے ساتھ ۱۱ر نومبر کو جواب دیا اور اس انکار پر دوبارہ غور کرنے پر زور دیا جس کے متعلق انہوں نے کہا کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں اس انکار سے غلط فہمی ہوگی۔

انہوں نے یہ بھی لکھا کہ اُن کے علم میں ابتک قوم کے کسی طبقہ نے جس میں مسٹر

---

[1] وزیر ہند۔

امیر علی بھی شامل ہیں، ان کے خلاف رائے نہیں ظاہر کی ہے۔ اور لارڈ کریو سے درخواست کی کہ وہ اس بات کا اندازہ کریں کہ کس حد تک مسٹر محمد علی اور مسٹر وزیر حسن اپنے ہندوستانی ہم مذہبوں کی نمایندگی کرتے ہیں اور یہ کہ لارڈ کریو اپنی اطلاع کو صرف سرکاری ذریعہ تک محدود نہ رکھیں۔

سر ولیم نے ۱۳ر نومبر کو جواب میں لکھا کہ لارڈ کریو کو پورے غور کے بعد اس بات کا افسوس ہے کہ وہ درخواست منظور کرنے سے قاصر ہیں مسٹر وزیر حسن اور مسٹر محمد علی نے ۱۳ر نومبر کو مسٹر اسکوئتھ[1] کو بھی اس مضمون کا خط لکھا۔ جس میں انہوں نے مسٹر اسکوئتھ اور سر ایڈورڈ گرے[2] کے حال کے بیانات متعلقہ ترکی پر ہندوستان کے مسلمانوں کے خیالات کو ظاہر کرنا بھی اپنا مقصد بیان کیا۔ مسٹر اسکوئتھ کے سیکرٹری نے آج ایک مختصر جواب لکھا کہ مسٹر اسکوئتھ افسوس کرتے ہیں کہ وہ ملاقات نہیں کر سکتے۔

(ہمدرد ۱۸ر نومبر ۱۹۱۳ء)

---

[1] برطانیہ کے وزیر اعظم۔

[2] برطانیہ کے وزیر خارجہ۔

(۶)

لارڈ مارلے[۱] کے نام خط

اپنے انگلستان پہنچنے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد مجھے یور لارڈشپ کو ایک نیاز نامہ ارسال کرنے کی عزت حاصل ہوئی تھی۔ جس میں میں نے جناب سے چند معاملات کے متعلق گفتگو کرنے کے لئے جنہوں نے مسلمانوں کے دلوں میں اضطراب پیدا کر رکھا ہے شرف ملاقات کی درخواست کی تھی۔ اور اس میں تعارف کا خط بھی ملفوف کیا تھا۔ جو از راہ مہربانی آنریبل مسٹر لارنس جنکنس چیف جسٹس آف بنگال نے یور لارڈشپ کے نام دیا تھا اس کے جواب میں مطلع کیا گیا کہ جناب بہت مصروف ہیں، اس لئے میری درخواست منظور نہیں کر سکتے۔

کیا میں اُمید کر سکتا ہوں یور لارڈشپ مجھے اور میرے دوست سید وزیر حسن سیکرٹری آل انڈیا مسلم لیگ کو ایک ملاقات کا شرف بخش سکیں گے؟ مجھے ڈر ہے کہ جناب کے دل میں صرف ہماری طرف سے نہیں بلکہ تمام ہندوستان کی مسلمان قوم کی طرف سے بھی آیا کسی قسم کی بُرائی تو نہیں ڈال دی گئی ہے۔ ہم نے بارہا کوششیں کیں لیکن اس بارے میں ناکامیاب رہے (اگر کامیابی ہوئی بھی تو بہت قلیل) کہ اپنے جوابات اخبارات میں چھپوائیں۔ اس لئے اور بھی زیادہ ضروری ہوا کہ ہم کسی بہت زیادہ ہمدرد اور فراخ حوصلہ وزیر کی باریابی حاصل کر کے ان پر اپنے خیالات جو ہندوستان کے مسلمانوں کے خیالات کا انعکاس ہیں ظاہر کر سکیں جو ہندوستان کے مسلمانوں کی بہبودی اور سلطنت کی بہبودی کے لئے بھی ضروری ہیں۔ اس بات سے ہم ناواقف

۱؎ مشہور آزاد خیال وزیر ہند

نہیں ہیں کہ آپکا تعلق ہندوستان کی خدمت سے براہِ راست نہیں ہے۔ اور اگر ہم آپ کو بلا ضرورت اس زمانے میں تکلیف دیں تو اس کے یہ معنی ہونگے کہ ہم کو کافی سمجھ نہیں اگر ہم اس کو ملتوی کر سکتے اور کسی دُوسرے وزیر سے مل سکتے تو ہم ضرور ایسا کرتے۔ ہمیں یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ ایسی روشن خیال وزارت کے زمانے میں بھی ہندوستان کے متعلق اتنی کم معلومات رکھی جاتی ہے اور کل انگلستان میں ایک درجن اشخاص بھی ایسے نہیں ہیں۔ جن کی ہندوستان کی بابت معلومات کسی طرح بھی قابل اطمینان تصوّر کی جاسکیں اور اگر ان سب کی معلوُمات کو جمع بھی کر دیا جائے۔ تو وہ مجموعہ جناب کی معلومات کے برابر نہیں ہوتا۔ ہم کسی خوشامد کی غرض نہیں کہتے بلکہ دراصل یہی ایک ایسی بات ہے جو ہم کو مجبوُر کرتی ہے کہ ہم آپ سے کسی قریبی تاریخ میں شرفِ باریابی حاصل کرنے کی مؤدّبانہ درخواست کریں۔

ہم اپنے خیالات کا اظہار کم از کم ایک گروہ کے سامنے آزاد اخبارات کے ذریعہ سے کر سکتے ہیں جنہوں نے اس کی ہم کو اجازت دیدی ہے۔ مگر چند ایسے معاملات ہیں اُن کے لئے بہتر یہ ہے کہ اُن کو بجائے اخبارات یا عوام کے سامنے پیش کرنے کے اُن کے متعلق براہ راست اراکین سے گفتگو کرنی چاہیئے۔ کیا آپ برائے مہربانی خوشی سے ہم کو شرف باریابی بخشیں گے۔ اور نہ صرف ہم کو ہی بلکہ ہمارے ہندوستانی بھائیوں اور ہم مذہبوں کو بھی مشکوریت کا موقعہ دینگے۔ امید ہے کہ آپ جواب سے جلد مشرف فرمائینگے

میں ہوں آپ کا نیازمند اور تابعدار

محمد علی ایڈیٹر ہمدرد کامرید

ہمدرد ۱۶ ردسمبر ۱۹۱۳ء

---

(۷)

لارڈ کریو[1] کے نام خط

یور لارڈشپ،

اگرچہ ہمیں بہت کچھ افسوس ہے کہ یور لارڈشپ نے ہمارے التماس کے مطابق شرف ملاقات نہ بخشنے کا قطعی فیصلہ کر لیا ہے۔ تاہم ہمیں اعتماد ہے کہ یور لارڈشپ ہز ہائینس آغا خاں کی اس چٹھی کی نقل پر مناسب توجہ فرمائیں گے۔ جو ہمیں موصول ہوئی ہے ہم یہ تو ظاہر کر چکے ہیں کہ ٹائمز اور دیگر یورپین اخبارات کس طرح سے ہمیں برا بھلا کہہ رہے ہیں اور یہ کہ جب ہم نے اپنی صفائی کے لئے خط بھیجے تو انہوں نے یا تو اُن کو شائع ہی نہیں کیا یا بہت بُری طرح کانٹ چھانٹ کر دی یا تلخیص کر دی اور ہم کو پبلک ڈنر دینے کے متعلق ہز ہائینس آغا کی تجویز کی ماہیت اور غرض کے متعلق غلط بیانی سے کام لیا گیا ہے۔ جس سے عرفاً ہمارے ساتھ ناانصافی کی گئی ہے۔ لیکن اس سے زیادہ قابل التفات وہ جھلک ہے جو یہ تحریریں نہ صرف ہمارے بلکہ "بڑھتی ہوئی جماعت" (جیسا کہ ہز ہائینس کہتے ہیں اور مسلمانان ہند جن کے ہم نمائندے ہیں) کے سیاسی رُخ اور مزاج پر ڈالتی ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ہز ہائینس آغا خاں کی مراسلت نہ صرف سوسائٹی میں بلکہ سیاسی حلقہ میں بھی ہماری بریت کرتی ہے۔ اور یہ کہ اخبارات کی غلط انداز تحریر کیسی ہیچ ہمارے خلاف جن کے ہم نمائندے ہیں حضور ملک معظم کی گورنمنٹ کے دل میں وہ بُرا خیال نہ بٹھلا دیں گے۔ جس کو آغا خاں لایعنی اور سراسر شرارت آمیز قیاس کرتے ہیں یعنی یہ کہ ہم اور وہ لوگ جن کے ہم نمائندے ہیں۔ مذہب تلک[2] یا سیاسی یا

---

[1] وزیر ہند۔ [2] لوکمانیہ تلک کانگرس کے انتہا پسند رہنما۔

اسلامی دیوانوں کے ساتھ کسی نوع ہمخیال یا ہمدرد ہیں"۔ گورنمنٹ سے ہماری عقیدت مندی جیسا کہ آغا خاں فرماتے ہیں" بلا شک وشبہ ہے" اور جو اتہام ہماری قوم پر لگائے گئے ہیں۔ وہ عموماً بے بنیاد ہیں یہ ہے وہ نفس الامر جسے ہز ہائینس صدقِ دل سے تسلیم کرتے ہیں اور اپنے مراسلت میں اس امر کو بھی بالکل صاف کرتے ہیں کہ اُن کو اُن تباہ کن پیچیدگیوں سے کوئی سروکار نہیں ہے جو ہز ہائینس کی روانگی کے بعد پیدا ہو گئی تھیں اور نہ ۳۱ اکتوبر کی ٹائمز کی اشاعت سے اُنکا کوئی تعلق ہے ہم اس نامہ وپیام کی پوری نقل ارسالِ خدمت کر رہے ہیں جو رائٹ آنریبل مسٹر امیر علی[1] ہم میں سے ایک کے مابین ہوتی ہے۔ تاکہ انڈیا آفس میں ان تباہ کن پیچیدگیوں کا کوئی سرکاری انکار کر دیا جائے۔ ہم یور لارڈشپ کی اس قدر تضیع اوقات پر معذرت چاہتے ہیں۔

ہم ہیں

یور لارڈشپ کے کمترین اور تابعدار خادم

محمد علی اور سید وزیر حسن

(ہمدرد ۲۳ دسمبر ۱۹۱۳ء)

---

[1] سید امیر علی انگریزی زبان کے مشہور مصنف، اس زمانے میں انگلستان میں پریوی کونسل کے رکن تھے اور مسلم لیگ کی لندن برانچ کے صدر۔

(۸)

ایک الوداعی لنچ

"۲۷ نومبر ۱۹۱۳ء کو ہم لوگ خود ایک الوداعی لنچ اپنے دوستوں اور ہمدردوں کو دے رہے ہیں اس لنچ کی حیثیت سیاسی او رنزاعی نہ ہوگی۔ بلکہ اُس کا مقصد یہ ہوگا کہ ہم ہندوستان اور انگلستان اور اسلام اور مسیحیت کے درمیان سفارت کا کام دے سکیں اور تا کہ ہم اپنے مخاطب انگریزوں اور انگریزنوں دونوں کو بتا دیں کہ وہ ہمارے ملک اور ہمارے مذہب سے ایسے بے تعلق تو نہ رہیں جیسے کہ اب تک رہ چکیں ہیں، بلکہ ہمارے عزم اور ہمارے مقصد اور ہمارے گلے شکوے خود ہماری زبان سے سن لیں مشہور افسانہ نگار ایچ جی ویلز سے ملاقات ہو ہی چکی ہے بلکہ اب کی جمعہ کو تو ان میاں بیوی نے اپنے ہاں رات کے کھانے پر مدعو کر دیا ہے اور وقت بھی میری خاطر سوا آٹھ کا رکھا ہے۔ کہ میں اس وقت تک ہندوستان کی ڈاک لکھنے سے فارغ ہو چکا ہوں"...... "ہندوستان اور اسلام کے معاملہ میں ان لوگوں کی بے خبری اور جمود دور کرنے اور انہیں بار بار چونکاتے رہنے کے لئے ضروری ہے کہ ہمارے ہمخیال لوگ ہندوستان سے بار بار آتے، اور یہاں کی رائے عامہ کو برابر تیار کرتے رہیں۔ بحیثیت مجموعی ہم مایوس نہیں ہیں"۔

(مکتوب ۱۶ دسمبر ۱۹۱۳ء، مولانا عبدالماجد کے ایک مضمون سے)

چوتھا سفر ۱۹۲۰ء

وفدِ خلافت

دریوزۂ خلافت

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے جائے
تو احکامِ حق سے نہ کر بے وفائی
نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا
خلافت کی کرنے لگا تو گدائی!
خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے
مسلماں کو ہے ننگ وہ بادشاہی
"مرا از شکستن چناں عار ناید
کہ از دیگراں خواستن مومیائی"

اقبالؔ

"خلافت کے لئے مسلمانانِ ہندوستان نے یورپ کو ایک وفد بھیجا جس کا سرکردہ میں تھا۔ تو ڈاکٹر صاحب (علامہ اقبال مرحوم) کو اس قدر غیرت آئی۔ اور میں اس غیرت کو بجا سمجھتا تھا، کہ انہوں نے "دریوزۂ خلافت" نام کا قطعہ لکھا جو اوپر درج ہے)
لیکن جب "دریوزہ گراں خلافت" خالی کاسۂ گدائی لے کر یورپ سے لوٹے مگر اس کا تہیہ کر کے کہ یہ "اتمام حجت" تھا۔ اس کے بعد یورپ کے سامنے ہرگز ہاتھ نہ پھیلائیں گے اگر قوت نہ ہوگی تو ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھنا تک پسند کرینگے مگر یورپ کے آگے ہاتھ

جوڑنا پسند نہ کرینگے اور اگر قوت ہوگی کھلا ہاتھ نہ بڑھیگا بلکہ بندھی ہوئی مٹھی سے کام لیا جائیگا۔

(ایک مضمون مؤرخہ ۱۲ اگست ۱۹۲۷ء)

چوتھا سفر ۱۹۲۰ء میں کیا گیا اور ایک آخری کوشش اس امر کی گئی تھی کہ خلافت عظمیٰ کو برقرار رکھا جائے۔ ترکی سلطنت کی قوت اور اُس کے اقتدار کی حفاظت کیجائے اور ترکوں کو اس غلامی سے محفوظ و مصئون رکھا جائے جس میں ہم خود ڈیڑھ سو پونے دو سو برس سے گرفتار تھے اور اس قبضہ کو قسطنطنیہ پر سے اُڑا دیا جائے۔ جو تقریباً چالیس برس سے مصر پر چلا آرہا تھا۔ گذشتہ تجربوں کی بنا پر جانتے تھے کہ کیا حشر ہوگا۔ مگر ع

رہے نہ دل میں ہوس آؤ یہ بھی کر دیکھیں !

پانچواں سفر ۱۹۲۸ء

سفرِ صحت

"آج عوام کو "ہمدرد" کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی اس لئے میں اسے بند کرتا ہوں اور ایک بار پھر غالب کے اس شعر کو دہراتا ہوں کہ ؎

غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا کیجئے ہائے ہائے کیوں

"......."قلمے" اور "قدمے" البتہ میں نے ممنونوں کی طرح ان کی امداد کی اور قرض میں بُری طرح گرفتار ہوگیا اور صحت کو بھی خیرباد کہہ چکا۔ ذیابیطس کے مرض کے باعث پہلے شکر ہی آیا کرتی تھی مگر امسال چربی (ALLUMINE) بھی آرہی ہے اور ایسی ٹون (AGETONE) زہر بھی آرہا ہے اور اعصابی سوزش (NEVRITIS) نے رات کی نیند اور دن کا آرام حرام کر دیا۔ اب "ہمدرد" کو بند کرتا ہوں اور باہر کی طلب پر کہیں بھی نہ جاسکوں گا۔

مجھے اس کا کبھی گمان بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ ایک ہندو فرمانروا جن سے ماہ اپریل سے پیشتر میں صرف دو ایک بار ہی ملا تھا اور وہ بھی گھنٹے دو گھنٹے سے زیادہ نہیں، ان پر میری خرابیٔ صحت کا یہ اثر پڑیگا کہ پہلے وہ خود میرا چند ماہ کے لئے فافوں پر علاج کرنے پر اصرار کرینگے اور بالآخر خود ہی بلا طلب بلکہ خود بھی کسی چیز سے یکایک متاثر ہوکر مجھے آمادہ فرمائیں گے کہ میں یورپ چلا جاؤں۔"

محمد علی

عزمِ سفر

"مجھے افسوس ہے کہ مجھے ہمدرد کے بند کرنے کے سوا چارہ کار نظر نہیں آتا، بہرحال میں تو چند ماہ کے لئے تمام کام بند کرکے اپنا علاج کرانے انگلستان جاؤنگا غیب سے مدد مل گئی اور مشورہ کرنے کے بعد امداد قبول کرلی گئی ہے، سوائے علاج کے کوئی اور غرض اس سفر کی نہیں ہے اور فاقہ کرکے علاج کیا جائے گا۔ کوئی اور کام کروں گا بھی نہیں"۔

۲۹ر اپریل ۱۹۲۸ء

(۱)

دہلی سے اجمیر۔ سابرمتی آشرم۔ بمبئی

۶ رجون ۲۸ء　　　　　　　　　　　　　　　　(جہاز "مقدونیہ")

پیارے ماجد میاں و ظفر الملک صاحب۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہٗ

۲۵ کو آپ لوگوں سے رخصت ہو کر ۲۶ مئی کی صبح کو اجمیر شریف پہنچا تاکہ جسمانی علاج سے پیشتر کچھ روحانی علاج بھی کر سکوں۔ نہ معلوم ظفر الملک صاحب کی "وہابیت" زیارت قبور کو کہاں تک روحانی علاج سمجھے اور کہاں تک خود اُسے مرض تصور کرے حقیقتاً جو کچھ ان مزارات کے گرد و پیش دیکھنے میں آتا ہے وہ مجھ جیسے "بدعتی" کو اس قدر صدمہ پہنچاتا ہے کہ عرض نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم ان تمام بدعات میں جو وہاں کی جاتی ہیں۔ اور نہایت بدتمیزی سے کی جاتی ہیں۔ میں جب کبھی اجمیر شریف آتا ہوں اور میری نظر اس مزار شریف پر پڑتی ہے تو میرا خیال اس زمانے کی طرف جاتا ہے جب سارے ہندوستان میں مشکل ہی سے کوئی مسلمان نظر آتا ہوگا، مشکل ہی سے کسی جگہ کوئی شخص ایک آن دیکھے خدا کو سجدہ کرتا ہوا دکھائی دیتا ہوگا، اور اذان کی آواز تو یقیناً کہیں بھی نہ آتی ہوگی، اور پھر میں خیال کرتا ہوں کہ ایک ایسے زمانے میں ایک سنجر کا رہنے والا سرکار مدینہ کے حکم سے غریب نوازی کو اپنا شعار بنا کر سلطان الہند بننے کے لئے ایک ایسے ملک میں آتا ہے اور کسی گوشہ کو اپنے لئے تلاش نہیں کرتا بلکہ راجپوتانے کے وسط میں ہندوستان کے سب سے بڑے راجہ کی راجدھانی میں داخل ہوتا ہے اور ایک پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھ کر اپنی پاک و صاف زندگی کے ذریعے سے اسلام

کا اعلان کرتا ہے۔ اور جس وقت ساری جنگی اور مادی قوتیں اسلام کے خلاف ہوتی ہیں، اعلائے کلمۃ الحق کرتا ہے اور ہزاروں لاکھوں کو مشرف بہ اسلام کرتا ہے۔ آج کل جبکہ ہزاروں لاکھوں نام کے مسلمان ہر وقت غیر مسلم اکثریت ہی کا رونا رویا کرتے ہیں، اس مزار پر جا کر اگر ہم اسی سبق کا آموختہ پھیریں کہ لقد نصرکم اللہ[1] فی مواطن کثیرۃ و یوم حنین اذا عجبتکم کثرتکم ولم تغن عنکم شیئاً وضاقت علیکم الارض بما رحبت ثم ولیتم مدبرین۔ تو مجھے یقین ہے کہ ہم پر بھی آج سکینہ نازل ہونے لگے! اور ہماری مدد کے لئے جنودا لم تروھا اتر آئیں۔ جاتے ہی درگاہ شریف پر حاضر ہوا۔ پھر مولانا معین الدین صاحب کے بھائی حکیم نظام الدین صاحب کے ہاں جا کر فروکش ہوا، اپنے آکسفرڈ کے رفیق صاحبزادہ عبدالواحد خاں سے جا کر ملا اور شب کو پھر درگاہ شریف جانے کے بعد رخصت ہوا۔

میرے جن نئے کرم فرمانے مجھے علاج کے لئے اس بار ولایت بھیجا ہے۔ اُن سے دوسرے دن آبو جا کر ملا۔ ۲۸ کو اُن سے بھی رخصت ہوا اور اس بار بھی انہوں نے شکریہ کے الفاظ کو زبان پر آنے سے روک دیا۔ اس لئے اس صحبت کو دعا پر ختم کیا اور بادیدۂ تر روانہ ہوا۔ ۲۸ کی شب کو احمد آباد پہنچا۔ انسویا بہن اپنے بھائی انبالال سارا بھائی اور اُن کے بال بچوں کے ہمراہ ولایت گئی ہوئی ہیں اور شنکر لال بینکر علیل تھے۔ لیکن انہوں نے انسویا بہن کی موٹر روانہ کر دی تھی۔ اور آشرم سے ایک مدراسی نوجوان مجھے لینے آ گئے تھے۔ اسی وقت

---

[1] اللہ نے تمہیں بہت سی جنگوں میں کامیابی دی اور خاص طور پر جنگ حنین میں فتح دی جب کہ تم اپنی کثرت کے گھمنڈ میں آ گئے تھے اور وقت پر وہ کثرت کسی کام نہ آئی اور باوجود کثرت کے تم شکست کھا گئے اور تم پر عرصۂ حیات وسیع ہونے کے باوجود تنگ ہو گیا اور تم پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے۔

سابرمتی گیا اور غسل کر کے سونے لیٹا مگر مگن لال بھائی کی جوان موت اور اُن کی بیاری بچی رادھا کے رنج وغم نے نیند کو بھگا دیا۔ تاہم صبح کو خاصی نیند آ گئی۔ نماز فجر کے بعد پہلے رادھا اور اس کی والدہ کے پاس گیا۔ پھر... اور مہاتما جی سے ملا اپنے ولایت جانے کا سارا قصہ سنایا۔ اور اُن کو اپنا ہم خیال پایا دوپہر کو جمنا لال جی بزاز کی فرودگاہ پر آرام کیا اور شام کو کھانا کھا کر شنکر لال بنیکر کے ساتھ اُن کے اور انسوئیا بہن کی قیام گاہ پر گیا۔ نماز مغرب پڑھ کر اسٹیشن کو روانہ ہوا تاکہ گجرات میل ہی میں روانہ ہو جاؤں اور نماز عید الضحیٰ سے پہلے ہی بمبئی پہنچ جاؤں۔ بمبئی میں عیدین کی نمازیں سورج نکلتے ہی ہو جایا کرتی ہیں، اس لئے ریل ہی میں غسل کر کے اور کپڑے بدل کر اور سامان اسٹیشن ہی پر چھوڑ کر، شوکت صاحب اور مولانا عرفان وغیرہ کے ساتھ ہی دفتر خلافت کے پاس والی چھوٹی مسجد کا رُخ کیا۔ جہاں نماز اچھی طرح مل گئی مگر اس قدر مختصر سی جماعت میں یقیناً وہ غرض پوری نہیں ہوئی۔ جو مساجد جامع میں بھی بمشکل پوری ہوتی ہے اور جس کے پورا کرنے کے لئے شہر کے باہر عید گاہ بنائی جاتی ہے اور اس عید کی نماز میں اصفہانی صاحب نے آلہ مکبر الصوت لگانے سے احتراز کیا اور میرے نزدیک سخت غلطی کی اور کٹ ملاؤں سے ڈر گئے میں اُن کا استفسار ہی پڑھ کر بھانپ گیا تھا کہ ان بزرگ پر ملاؤں کا خوف غالب ہے جو جماعت گرامو فون کو باجا کہتی ہے اور اس میں قرآن کریم کی قرأت سننے کو لہو و لعب سمجھتی ہے۔ اس سے "لاؤڈ اسپیکر" کیلئے فتوے طلب کرنا ہی حماقت ہے۔ عید کا دن اور دوسرا دن حاجی اسمٰعیل صاحب۔ خلافت کے سیٹھ اور بیگے دوست کے ہاں دعوتوں میں گزرا یا مسز نائیڈو کے ہاں کی دعوت میں۔ بیگم جون کو کچھ کھدر اور اُون کی جرابیں کڑاک صاحب کے کارخانے میں جا کر بنوائیں۔ ٹکٹ اسی مٹی ہی کو لے لیا تھا۔ ۲ کو سب سامان بٹورا اور باندھا اور کمپنی کے سپرد کیا۔

اور پھر کچھ آم لے کر اور کچھ ہار پھول بٹور کر بندرگاہ پر گیا۔ کمپنی کی نوازش سے ۴ ٹکٹ جہاز پر جاکر رخصت کرنے کے لئے دوستوں کے واسطے مفت مل گئے تھے، حالانکہ فی ٹکٹ ستّے روپیہ قیمت دینا پڑتی ہے۔ بندر پر ڈاکٹر کو نبض دکھائی۔ اُنہوں نے پوچھا کہ اچھے ہو، میں نے کہا کہ اچھا ہوتا تو ولایت ہی کیوں جاتا، بارڈولی نہ گیا ہوتا مگر ان کا اطمینان کر دیا کہ میرا مرض متعدی نہیں ہے (اور اب تو میری سیاست بھی متعدی نہیں ہے نہ بظاہر میرا مذہب بھی متعدی ہے) ایک پولیس کے انگریز افسر صاحب نے طارق تک سے ٹکٹ مانگا، اور شوکت صاحب غصّہ کے مارے اُسی وقت اپنے ٹکٹ کو پھینک کر واپس جا رہے تھے، مگر ڈاکٹر نے طارق صاحب کو بھی اسی ٹکٹ میں شامل ہونے اور جہاز پر جانے کی اجازت دیدی۔ روانگی کا وقت سُنا ہے کہ ایک بجے ہوتا ہے۔ اس سے پہلے سب رخصت کرنے والے رخصت کر دیئے گئے۔ مگر ڈاک ڈیڑھ بجے تک بار کی جاتی رہی اور ڈیڑھ بجے ہم ہندوستان کے ساحل سے رخصت ہوئے۔

کیا کہوں کہ کن افکار اور کن خیالات کا اس وقت دل میں اور دماغ میں ہجوم تھا۔ پہلا سفر ۱۸۹۸ء کا کن امنگوں اور کن امیدوں کے ساتھ شروع ہوا تھا۔ ایک غریب بھائی کی بے نظیر اور حیرت انگیز ہمّت کی بدولت یکایک آکسفرڈ جانے کا انتظام ہوا تھا، پیسہ عنقا کا حکم رکھتا تھا۔ سول سروس میں کامیابی کی آرزو تھی۔ دوسرا سفر ۱۹۰۲ء میں ہوا تھا جب کہ سول سروس میں ناکام رہ چکا تھا۔ شوکت صاحب بھی ناکامی کی خبر مدراس یونیورسٹی میں پڑھ کر زرد پڑ گئے تھے، مگر ایک بڑھیا نے دیکھتے ہی تاڑ لیا تھا کہ کیا ہوا اور پوچھا تھا کہ کیا محمد علی کی امتحان میں ناکامی ہی پر اس قدر مایوس ہوتے ہو۔ اگر اس نے چوری کی ہوتی، یا مرتد ہو گیا ہوتا تب تمہاری کیا حالت ہوتی۔ محمد علی کو لکھو کہ میرا اسے دیکھنے کو جی چاہتا ہے اور اس کی منگیتر بھی تین ساڑھے

برس سے بیٹھی ہے، اب اُسے بلا لو، اور اس کی شادی کر دو۔ یہیں بلایا گیا تھا، شادی بھی ہوئی تھی، رام پور میں محکمہ تعلیم کا افسر بھی مقرر ہو چکا تھا۔ اور اب صرف آکسفرڈ کا بی۔اے کا امتحان دینے جا رہا تھا۔ رام پور میں جو واقعات گزر چکے تھے وہ بعد پریشان کن اور بالآخر میرے استعفے کا پیش خیمہ تھے۔ نہیں کہہ سکتا تھا کہ کیا حشر ہوگا جو حشر ہوا وہ آپ کو معلوم ہے۔ تیسرا سفر سید وزیر حسن صاحب کی معیت میں ۱۹۱۳ء میں چھپ چھپا کر ہوا تھا کہ کہیں میرے کرم فرما میسٹن صاحب جن سے دو ہفتے پیشتر ہم سدھار رہے تھے۔ سنتے ہی میری گرفتاری کا وارنٹ نہ نکال دیں "ایم علی" اور "ڈبلیو حسن" کے نام کے دہلی سے ٹکٹ خریدے گئے تھے۔ سورج نکلنے سے پیشتر، شوکت صاحب کے ساتھ دہلی کے اسٹیشن سے عیدالفطر کے دوسرے ہی دن اس طرح روانہ ہوا تھا۔ کہ گویا شوکت صاحب کو صرف پہنچانے آیا ہوں۔ گھر میں نہ بچیوں کو خبر تھی، نہ نوکروں کو اور سامان بھی یہ کہہ کر بندھوایا تھا کہ شملے جا رہا ہوں وہاں سردی پڑتی ہے، گرم کپڑے زیادہ رکھنا، کانپور کی مسجد شہید ہو چکی تھی، سو سے زیادہ مسلمان جن میں بوڑھے بھی تھے اور بچے بھی، اس وقت قید تھے۔ ایڈریانوپل کے فاتح ترکوں سے ایسکویتھ صاحب اور سر ایڈورڈ گرے سختی کے ساتھ مطالبہ فرما رہے تھے، "کمریڈ" کے اڈیٹر نے پریس ایکٹ کے خلاف ایک بے نظیر فیصلہ سر لارنس جینکنس کلکتہ ہائیکورٹ کے چیف جسٹس اور دو سب سے سینیر ججوں کا حاصل کر لیا تھا۔ گو "مقدونیہ آؤ اور ہماری مدد کرو" والا پمفلٹ، جس میں بلقانی حلیفوں کے مظالم کی داستانِ غم نصاریٰ ہی کو سنائی گئی تھی، پھر بھی واپس نہ مل سکا تھا۔ انگلستان کی لبرل حکومت کے پاس جا کر منت سماجت کرنا تھی۔ اس کا بھی جو حشر ہوا وہ آپ کو معلوم ہے۔

چوتھا سفر ۱۹۲۰ء میں کیا گیا اور ایک آخری کوشش اس امر کی کی گئی تھی

کہ خلافت عظمیٰ کو برقرار رکھا جائے۔ ترکی سلطنت کی قوت اور اس کے اقتدار کی حفاظت کی جائے اور ترکوں کو اس غلامی سے محفوظ و مصئون رکھا جائے جسمیں ہم خود ڈیڑھ سو پونے دو سو برس سے گرفتار تھے، اور اس قبضہ کو قسطنطنیہ پر سے اُٹھوایا جائے جو تقریباً چالیس برس سے مصر پر چلا آرہا تھا۔ گزشتہ تجربوں کی بنا پر جانتے تھے کہ کیا حشر ہوگا مگر ع

رہے نہ دل میں ہوس آؤ یہ بھی کر دیکھیں

اس خیال سے احرام سفر باندھا گیا تھا۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ اُس کا بھی کیا حشر ہوا۔

اس سفر کے بعد توبہ کر لی تھی کہ اب آستان بوسی نہ کریں گے، اگر پھر جائیں گے تو اسی لئے کہ انگلستان اور ہندوستان کے درمیان معاہدہ پر دستخط کریں۔ افسوس وہ معاہدہ آج بھی دُور نظر آتا ہے مگر الحمد للہ کہ توبہ آج بھی نہیں ٹوٹی۔ سر ڈینس رے فارن سکرٹری صاحب کو پاسپورٹ کے لئے شملہ ٹیلیفون کیا تو اُن کے سوال کے جواب میں صاف کہہ دیا کہ اب نہ مجھے برطانیہ کی کسی سیاسی جماعت پر اعتماد ہے نہ یورپ کی کسی حکومت پر کہ کسی سیاسی کام کی غرض سے یورپ کو جاؤں، اور آج مسٹر واٹسن پولٹیکل سکرٹری صاحب سے جہاز پر ملاقات ہوئی۔ تو ان کی غلط فہمی کو بھی دُور کر دیا کہ میں ٹیلر کمیٹی کے سلسلہ میں انگلستان جارہا ہوں محض اپنی صحت کی اصلاح کے لئے بھیجا گیا ہوں، اور اس پر بھی ہنسی آتی ہے کہ ایک فاقہ کش ملک سے ایک متمول ملک کی طرف ایک فاقہ مست بہ صرف کثیر اس لئے سفر کر رہا ہے کہ وہاں جا کر فاقہ کرا کے اپنا علاج کرائے۔

ہندوستانی عورتیں اس جہاز پر بھی ہندوستانی لباس میں سفر کر رہی ہیں مگر سوائے مسز بیسنٹ کے اخبار نیو انڈیا کے ایڈیٹوریل اسٹاف کے ایک رکن کے جو اچکن اور آڑا پاجامہ پہنے ہوئے ہیں، مردوں میں صرف میں ہی ایشیائی لباس

میں ملبوس ہوں۔ ۲ ؍ جون کا دن اچھا گزرا مگر ۳۔ ۴ اور ۵ کو ہوا تیز رہی اور تیز تر ہی ہوتی گئی۔ یہ وہ موسمی ہوا ہے جس کا نام بگاڑ کر "مانسون" کر لیا گیا ہے، اور جو ہندوستان کے لئے بارش لا رہی ہے۔ دہلی کی گرمی کا خیال کر کے دعا نکلتی ہے کہ بہ جلد بمبئی پہنچے اور سب طرف جل تھل کر دے، لیکن جہاز والوں کا خیال کرتا ہوں اور بالخصوص عورتوں کا تو جی چاہتا ہے کہ دعا کروں کہ ہوا بند ہو جائے اور سمندر کی یہ طغیانی باقی نہ رہے۔ تاہم خلاف توقع میں بالکل اچھا رہا۔ اور ایک وقت کا کھانا بھی نہ چھوڑنا پڑا، حالانکہ آدھے سے زیادہ مسافر اور تین چوتھائی سے زیادہ مسافر عورتیں کھانے کے کمرے سے غیر حاضر رہنے لگی تھیں۔ البتہ آج صبح کے بعد سے تموج میں بہت کمی ہو گئی، اور آج شب کے ساڑھے آٹھ بجے سے، جب سے یہ خط شروع کیا گیا ہے، جہاز پر مردوں اور عورتوں کا ناچ ہو رہا ہے، حالانکہ کل شب کو ان میں سے اکثر خاموش پڑے تھے۔ اور ناچ ہو رہا تھا تو سمندر کی موجوں کا ہو رہا تھا۔

علاوہ مہاراجہ صاحب الور کے وزیر اعظم کے جو میرے ہم سفر ہیں، اور چند ہندوستانیوں کے میری کسی سے گفتگو نہیں ہوئی، اور اس فرصت کو غنیمت جان کر میں نے یا تو اپنی نیند کا قرضہ جو مدتوں سے چڑھا ہوا تھا وصول کیا، یا کچھ فرانسیسی زبان سیکھنے کی کوشش کی۔ مرحوم علی گڑھ کالج کے مرحوم طالب علم سابق محمد داؤد صاحب کی نظموں کو ان کے چھوٹے بھائی محمود احمد عباسی پھر شائع کر رہے ہیں، اور مجھ سے تقریظ لکھنے کا وعدہ لے چکے ہیں۔ ان کا خط جہاز پر بھی ملا، اس لئے خطوں سے بھی پہلے آپ کے نام کا یہ خط شروع کیا اور اب اگر آپ اجازت دیں تو اسے ختم کروں۔

ڈیک پر میرے نزدیک ہی تین انگریزوں کے بچے، دو لڑکیاں اور ایک

لڑکا کھیلا کرتے ہیں۔ ان سے یا ان کے والدین سے ہی کبھی کبھی دو چار باتیں ہو جایا کرتی تھیں۔ یا دو بہار کے انگریز زمینداروں سے جو نیل تیار کرایا کرتے ہیں۔ لیکن میرے قریب ہی ایک خوش رو، وجیہ اور بلند قامت فوجی افسر بھی لیٹے رہتے تھے۔ اور کبھی کبھی ایک دو لفظ بول لیا کرتے تھے۔ آج ایک بجے سے میری دیر تک گفتگو ہوتی رہی جسمیں زیادہ تر میری بچیوں کے نام اور اُن کی عمر وغیرہ کے متعلق اس کے سوالات اور میرے جوابات تھے۔ بہ ظاہر اُسے سُن کر اور کچھ دلچسپ پاکر ان صاحب نے مجھ سے گفتگو کی اور دو گھنٹے تک نہایت آزادی اور صفائی سے مگر پُر لطف طریقہ پر سیاسی گفتگو رہی، جس کے بعد انہوں نے شکریہ بھی ادا کیا اور داد تحسین بھی دی۔ بعد کو معلوم ہوا کہ یہ بریگیڈیر جنرل ہیں اور میں نے آخر میں نام دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ان کے بزرگ میرے دادا کے ۵۸-۱۸۵۷ء کے دوست تھے۔ اب تک کی ساری داستان میں نے آپ کو سُنا دی۔ اب نہ کہئے گا کہ میں نے خاموشی سے کام لیا ہے۔ کل سے انشاء اللہ حدیث شریف بھی شروع ہو جائے گی۔ اور چونکہ حجاج کے جہازوں کی واپسی کا وقت ہے۔ رستہ میں آنکھیں اُن کو بھی ڈھونڈیں گی۔ ہائے ؎

نہ ہے سعادتِ آں بندۂ کہ کرد نزول گہے بہ بیت خدا و گہے بہ بیت رسول

مگر خدا بھلا کرے سلطان ابنِ سعود کا، اب وہاں کا راستہ بھی ہم بدبختوں کے لئے بند ہے۔ جہاز ہی پر خبر پڑھی کہ ہم سے بھی زیادہ بدبخت شامی جنہوں نے ترکوں کے خلاف بغاوت میں سب سے بڑا حصّہ لیا تھا، اور اس کے صلے میں فرانس کی غلامی اور ۵۸ گھنٹے اس کی مسلسل گولہ باری حاصل کی تھی، اُنہوں نے اب فیصلہ کیا ہے کہ اُن کی نجات کے لئے ایک بادشاہ کی ضرورت ہے۔ چنانچہ ابن سلطان: بن سعود پر اُن کی نظرِ انتخاب پڑی ہے۔ سچ ہے ملکیت کی

بدعت کی ابتدا شام ہی سے ہوئی تھی، اب یزید کی ملکیت کی جگہ نجدیوں کی ملکیت کی طلب ہے۔ اچھا اب رخصت ہوتا ہوں تعجب ہے کہ اعصابی سوزش جہاز پر آتے ہی بند ہوگئی، مگر کل دوپہر کو، اور آج صبح کو تھوڑی دیر تک محسوس ہوئی۔ لیکن یقیناً یہ آموں کا پھل ہے، سو بندرگاہ سعید تک وہ بھی ختم ہو جائینگے۔ اور لندن جاتے ہی فاقہ ہی فاقہ ہے۔

قطب میاں صاحب کو، اور الطاف بھائی کو، سعید کو اور تمام فرنگی محل کو سلام شوق، بالخصوص جمال میاں اور محمد میاں اور نور میاں کو۔ مولانا سلامت اللہ صاحب کی خیریت تحریر فرمائیے۔ دہلی میں جعفری کو پیار اور سب کو سلام شوق بالخصوص مولانا کفایت اللہ صاحب کی خدمت میں آداب۔ مولانا احمد سعید صاحب کو سلام شوق اور ان کی صحت کے متعلق اطلاع دیجئے۔ ڈاکٹر سعید احمد صاحب اور اسرائیلی صاحب، راشد الخیری صاحب کو بھی سلام و شوق۔

آپ کی عالی ہمتی کا قدردان "ہمدرد" کا دعاگو آپ کا بھائی

محمد علی

(۲)

بمبئی سے روانگی

۷ رجون ۱۹۲۸ء جہاز "مقدونیہ"

ہوا کی تیزی، سمندر کا تموج اور جہاز پر اپنی خاموش گوشہ نشین زندگی کا حال سب کچھ لکھ چکا ہوں۔ تم کو کیا کیا لکھوں ساری عمر میں ایک بار بھی اس طرح سفر نہیں کیا جس طرح اس بار سفر کر رہا ہوں، دل کی جو کیفیت ہے وہ کن الفاظ میں بیان کروں، تم غالباً میری خاموشی کو خوب سمجھ جاؤ گے، میرے لئے دعا کرو۔ جو صدمہ مجھے اس بار گزرا ہے۔ اُس کے برابر کبھی کوئی صدمہ نہیں ہوا، لیکن کسی سے کچھ نہیں کہہ سکتا، خداوند کریم سے دعا ہے کہ میری اس عجیب و غریب اور غیر متوقع ناگہانی مصیبت کو بھی دُور فرمائے۔ سفر بخیر گزر رہا ہے لیکن درد اسی طرح باقی ہے۔ کوئی ہمراز اور شریک غم بھی نہیں۔ قیدِ تنہائی سے بڑھ کر تنہائی ہے۔ بس لا تحزن ان اللہ معنا پر میرا ایمان قائم ہے۔

(عدن پہنچنے پر عدن کے ایک منظر کی تصویر کی پشت پر لکھا ہے)

ابھی عدن ہو کر آیا ہوں، ہندوستان کی غلامی کے لئے یہ بھی غلام ہے۔ جبل الطارق ہی سے ہندوستانی غلامی کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہ آخری کڑی ہے۔ خدا اس زنجیر کو جلد توڑے۔

---

[۱] مولانا محمد عرفان صاحب مرحوم سیکرٹری مرکزی خلافت کے نام ایک خط

(۳)

مقدونیہ جہاز

۷ر جون ۱۹۲۶ء — عدن

(۱)

میاں طارق[1]

جلد پڑھ لکھ کر جوان ہو جاؤ
اور عدن سے لے جبل الطارق تک
کو آزاد کراؤ

تمہارا نانا ابا

محمد علی

---

[1] مولانا مرحوم کے نواسے زاہد صاحب کے فرزند رشید

مقدونیہ جہاز

خدا تمہیں[1] اور زہرہ[2] اور طارق کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ جہاز کا سفر خاموشی سے گزر رہا ہے۔ ہوا روز بروز تیز ہوتی گئی اور سمندر میں تموج بڑھتا گیا۔ مگر میں اچھا رہا، حالانکہ بہت ہی کم عورتیں اور نصف مرد اچھے رہے۔ تاہم کل سے ہوا دھیمی پڑی ہے۔ اور تموج کم ہوا ہے تو لطف آ رہا ہے۔

میرے پیروں میں بھی سوزش بظاہر غائب تھی۔ مگر پرسوں سہ پہر کو اور کل صبح تھوڑی دیر کو پھر محسوس ہوئی جو یقیناً آموں کا اثر ہے۔

زہرہ سے کہہ دینا کہ پریشان نہ ہو۔ خدا نے چاہا تو کامل شفا ہو جائے گی۔ بھائی اس کم بخت جنجوم؟ پر تقاضاء کر کے روپیہ دہلی بھجوا دو۔ مکان کا کرایہ ابھی بہت باقی ہے۔ وہ مل جائے تو ادا کر دیا جائے۔

طارق صاحب کے نام خط نیچے لکھتا ہوں۔ ان کو ہجے کر کے پڑھوا دینا۔

میرے پیارے طارق صاحب

جب سے تم جہاز پر سے گئے ہو بہت یاد آتے ہو۔ نانا ابا کو مت بھولنا اللہ میاں سے دعا مانگتے رہنا۔

تم کو بہت سا پیار۔ زہرہ کو پیار۔ سب کو سلام

تمہارے نانا ابا   تمہارا خیر طلب   محمد علی

---

[1] زاہد صاحب مولینا شوکت علی صاحب کے بڑے صاحب زادے اور مولینا محمد علی صاحب کے داماد

[2] مولینا مرحوم کی بڑی صاحب زادی اور زاہد صاحب کی زوجہ محترمہ

(۴)

عدن

مقدونیہ جہاز

۱۰ جون ۱۹۲۸ء

خداوند کریم تمہیں[1] اور بچیوں کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ عدن سے ہم لوگ تین بجے چلنے والے تھے مگر جہاز کا ایک دروازہ ٹوٹ گیا تھا۔ اس لئے مرمت کے لئے کنارہ پر بھیجا گیا تھا۔ وہ مغرب کے قریب واپس آیا تو جہاز روانہ ہوا۔ تم جانتی ہو کہ عدن کے آگے بڑھ کر باب المندب میں سے گزرتے ہیں اور پھر جہاز کا رُخ بدل جاتا ہے۔ کیونکہ بحیرہ عرب میں تو بمبئی سے عدن تک مغرب کی سمت جہاز چلا کرتے ہیں۔ اور باب المندب کے بعد بحر احمر شروع ہو جاتا ہے اور جہاز کا رُخ شمال کی طرف پھر جاتا ہے۔ اب موسمی ہوا جو ہندوستان میں بارش لاتی ہے نہیں ملتی۔ ہوا بہت کم رہ جاتی ہے اور افریقہ اور یمن اور حجاز کے ساحل کی گرمی سے سابقہ پڑتا ہے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ سمندر تو بالکل میز کی طرح تھا مگر پسینہ بے حد آرہا تھا۔ میں افریقہ کے ساحل کیطرف یعنی مغرب کے رُخ اپنی کرسی ڈالے بیٹھا رہا کرتا تھا۔ صبح کو تو دوسری طرف سورج ہوتا تھا اور گرمی ادھر ہوتی تھی۔ اِدھر ٹھنڈک رہتی تھی۔ مگر دوپہر کے بعد دھوپ ادھر آ جاتی تھی اور سورج ڈوبنے تک گرمی رہتی تھی۔ جہاز کا سر جس طرف ہوتا ہے اُس طرف میری کرسی ہے۔ اس لئے ہوا تو خوب آتی ہے بلکہ اس مرتبہ خلاف معمول ہوا خاصی تیز تھی اور آج تو صبح کو خوب سردی تھی۔ سہ پہر کو ہم لوگ جدہ کے پاس سے گزرے، یعنی اسکے مقابل سے۔ ورنہ یہ جہاز تو عرب کے ساحل سے دُور دُور جاتے ہیں خدا سے دُعا کی کہ ہم سب کو ایک بار پھر اپنے اور اپنے رسول اکرمؐ کے گھر لے جائے اور حج و زیارت کا ثواب عطا فرمائے۔ پرسوں شام کو ہمیں معلوم ہوا کہ ہم لوگ سویز سے موٹروں

---

[1] محترمہ بیگم صاحبہ۔

میں ملک مصر کی دارالسلطنت قاہرہ کو تین گھنٹے میں جا سکتے ہیں اور دن بھر شہر دیکھ کر شام کو چھ بجے کی ریل سے دس بجے رات بندرگاہ سعید پہنچ سکتے ہیں۔ اس وقت جہاز بھی نہر سویز میں سے ہلکے ہلکے نکل کر بندرگاہ سعید پہنچ جاتا ہے۔ چنانچہ ہمارے جہاز کے پندرہ بیس آدمی کل علے الصبح یعنی کوئی چھ بجے جہاز سے اُتر کر موٹروں میں قاہرہ جائینگے، مجھے تو زیادہ سیر نہیں کرنی ہے۔ ۱۹۱۳ء میں جب سید[1] وزیر حسن صاحب کے ساتھ گیا تھا تو رات کے گیارہ بجے ریل قاہرہ پہنچی تھی لیکن دن کی طرح روشنی ہو رہی تھی۔ اور صبح کے تین بجے تک بازار میں رونق تھی۔ اُسی وقت موٹر لے کر ہم لوگ اھرام یعنی فرعونوں کی قبریں دیکھنے گئے تھے اور صبح کو آٹھ بجے اپنے ہوٹل واپس آئے تھے۔ نہا دھو کر ناشتہ کر کے اسٹیشن جاتے ہوئے اخبار اللوا (جس کا نام اس وقت الشعب تھا) کے دفتر بھی گئے تھے۔ اس وقت مسجد جامع الازھر[2] کے دیکھنے اور کسی سے ملنے کا موقعہ نہیں ملا تھا۔ اس لئے کہ ٹرین گیارہ بجے دن کے چلتی تھی اور ۴ بجے شام کے بندر سعید پہنچا دیتی تھی، جس کے بعد جہاز روانہ ہوتا تھا، اس بار صرف مسجد الازھر اور مسجد محمد علی[3] وغیرہ دیکھنی ہے اور امام شافعی[4] رحمۃ اللہ علیہ کے مزار مبارک پر جا کر فاتحہ پڑھنی ہے، نیز سعد[5] پاشا زاغلول کی قبر پر بھی جانا ہے اور صرف چند دوستوں سے ملنا ہے جن سے ۱۹۲۰ء میں سوئٹزرلینڈ میں ملاقات ہوئی تھی، میں نے اُن کو پرسوں شب ہی تار دے دیا ہے، مگر تعجب ہے کہ اب تک کوئی جواب نہیں آیا۔ جو حالات

---

[1] مسلم لیگ کے سیکرٹری جو بعد میں یو۔پی کے ہائی کورٹ کے جج بنے۔

[2] دنیا کی قدیم ترین درسگاہ جو ایک ہزار سال سے برابر قائم ہے۔

[3] محمد علی پاشا موجودہ شاہی خاندان کے جدّ امجد۔

[4] امام شافعی کی آخری عمر مصر میں گزری، اور یہیں انتقال فرمایا۔

[5] مصر کے مشہور قوم پرور رئیم۔

ہونگے وہ واپسی پر لکھوں گا۔ مگر غالباً ڈاک میں خط مارسیلز سے (یعنی فرانس کے ساحل سے) پہلے نہ ڈال سکوں گا، خط یا تو میں جہاز پہ چھوڑ جاؤں گا کہ کل ڈاک میں ڈال دیا جائے یا اپنے ہمراہ قاہرہ لے جاکر وہاں کے ڈاک خانہ سے ڈالوں گا۔ میری خاموشی کی زندگی بدستور جاری ہے، رفتہ رفتہ متعدد انگریزوں نے آکر بات چیت کی اور اب دس پندرہ کے ساتھ علیک سلیک ہو جاتی ہے۔ مسٹر برج لال نہرو کے (جو دہلی میں رہتے ہیں) بہن اور بہنوئی سیکنڈ کلاس میں ولایت جا رہے ہیں۔ اُن کا لڑکا اچھا نہیں ہے، یونیورسٹی کے امتحان کا زمانہ قریب تھا۔ اور اگست میں سول سروس کے مقابلے کے امتحان میں شریک ہونے والا تھا کہ خبر آئی ہے دماغ پر کچھ اثر پڑا ہے۔ بیچارے ماں باپ بہت پریشان ہیں۔ روز اُن کے پاس جاکر تسلی تشفی کر دیتا ہوں۔ ناگپور کے بیرسٹر اور اسمبلی کے ممبر سر ہری سنگھ گور کی لڑکی مسز دت بھی سیکنڈ کلاس میں سفر کر رہی ہیں، کل اُن سے بھی ملاقات ہوئی، ہمارے درجہ میں اور کھانے کے کمرے میں میری کرسی کے پاس کی کرسی پر مس تمام سفر کر رہی ہیں، یہ دہلی کے زنانہ طبی کالج (لیڈی ہارڈنگ کالج) میں کیمیا سکھاتی ہیں، ان کے والد اور والدہ ولایت ہی میں ہیں اور ڈاکٹر ہیں وہ آپ سے بھی ایک بار مل چکی ہیں۔

اچھا اب رخصت ہوتا ہوں، میری طبیعت بہت اچھی ہے حالانکہ آم خوب کھائے، اب سڑے جاتے ہیں اگر بچ رہے تو کل شاید مصر لے جاؤں اور وہاں دوستوں کو چکھاؤں۔ چونکہ کچھ زیادہ لکھنے کو نہیں ہے، اس لئے بچوں کو علیحدہ علیحدہ نہیں لکھتا، دونوں کو خوب پیار کر لینا۔

میں نے عدن سے سفر کے مع الخیر یہاں تک ختم ہونے کا تار "کمر بند" کے پتہ سے دن کے ڈیڑھ بجے دیا تھا، وہ جون کو وہ کس وقت ملا، ضرور لکھنا۔

تمہارا محمد علی

عدن سے قاہرہ

پیارے ماجد[1] میاں و ظفر الملک۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔ آپ کو خط لکھ کر ڈاک میں ۷ کو جہاز ہی میں ڈال دیا تھا۔ بارہ بجے کے قریب جہاز سے اُتر کر نواب عقیل جنگ بلگرامی کے ساتھ (جو نواب عماد الملک بلگرامی مرحوم کے صاحبزادے اور حیدرآباد میں پبلک ورکس کے منسٹر ہیں اور پتھری نکلوانے ولایت جارہے ہیں) عدن گیا۔ ہندوستان کے جو نوٹ بچ گئے تھے اُن کو ہم دونوں نے کاؤس جی ڈنشا کی مشہور دکان پر جاکر بدلوایا۔ سر کاؤس جی ڈنشا خود عدن میں نہ تھے، اُنکے صاحبزادے تھے، انہوں نے سنتے ہی مجھے اپنے سکونتی کمروں میں بلایا اور کھانے کی دعوت کی، مگر مجھے ابھی یاسین خاں صاحب سے جو علی گڈھ کے پُرانے طالب علم یامین خان صاحب ممبر اسمبلی کے بھائی اور مشہور سوپ کمپنی "میرٹھ" کے ایک رکن ہیں اور یہاں عرصہ سے مجسٹریٹ ہیں، جانا تھا، اس لئے معذرت کر کے چلا آیا۔ یہ کہنا بھول گیا کہ جونہی اسٹیم لانچ سے عدن طواہی کے ساحل پر اترا تھا، عرب صرافوں، پولیس والوں، قلیوں اور ٹیکسی والوں نے پہچان لیا تھا کہ "یہ محمد علی شوکت علی" ہے اور بعض نے بڑی محبت سے مصافحہ کیا اور ہاتھ چومنا چاہا۔ کاؤس جی ڈنشا کی دکان سے ایک عرب لڑکے کی معیت میں ٹیکسی سے یاسین خان کے دفتر گیا، مگر معلوم ہوا کہ وہ کام ختم کر کے گھر جاچکے ہیں۔ جب سنہ ۱۹۲۰ء میں یورپ سے واپس ہوا تھا تو حیات

---

[1] یورپ جاتے وقت مولانا "ہمدرد" اخبار ان دونوں بزرگوں کے سپرد کر گئے تھے۔ جعفری صاحب ایڈیٹر تھے، اور ماجد صاحب اور ظفر الملک صاحب نگراں و منصرم

نے کہا تھا کہ چلو یا سمین خان سے چل کر مل آئیں اور انہی کے ساتھ ان کے ہوٹل میں دوپہر کا کھانا کھایا تھا۔ اور عدن کے مشہور قدیم Water Works کی سیر کی تھی، اور شیخ العیدروس رحمۃ اللہ علیہ کے مزار مبارک پر جا کر فاتحہ پڑھی تھی اور بازار جا کر یمن کی بنی ہوئی نہایت خوبصورت چپلیاں خریدی تھیں۔ اس بار دیکھا کہ انہوں نے ایک بنگلہ لے رکھا ہے اور جب ہم پہنچے تو کھانا کھا کر آم کھا رہے تھے۔ غریب کا اکیلا دم، دو مہمانوں کے لئے کھانا اس وقت کہاں، مگر کہا کہ ابھی انڈے وغیرہ تلوائے دیتا ہوں۔ کھانا کھا لو، لیکن ہم دونوں نے کہا کہ اب جہاز ہی پر جا کر لنچ کھائیں گے، آموں کی دعوت سے انکار نہ کیا جا سکا۔ بمبئی کے عمدہ الفانسو (یا ہافز) پھر چکھنے میں آئے، اور گھنٹہ دو گھنٹہ امام یحییٰ، امام ادریسی کے خاندان، شیخ سنوسی، سلطان ابن سعود اور جیہ اور جیزان پر والیان نجد و یمن کے قضیہ۔ اور بعض قبائل یمن کی برطانوی حمایت وغیرہ کے حالات کے متعلق معلومات حاصل کر کے، کوئی سوا نبجے رخصت ہوا۔

جہاز کے بہت ہی کم مسافر عدن آئے تھے، سب گرمی کا خوف ظاہر کرتے تھے لیکن یہاں دوپہر کو بھی وہ گرمی نہ تھی جو چلتے وقت دہلی میں صبح کے آٹھ بجے پڑنے لگی تھی، اس لئے مجھے اس کی کیا پرواہ ہو سکتی تھی۔ عدن کی ٹیکسی کلکتہ اور بمبئی کی طرح تو نہ تھی، لیکن دہلی کے ٹیکسیوں سے ہزارہا درجہ اچھی تھی، اور کلکتہ اور بمبئی کے نرخ سے چلتی تھی۔ چلانے والے عرب تھے، اور بے تحاشا دوڑاتے تھے، اور باوجودیکہ ساحل طوائی سے عدن تک جانے کے راستہ میں ایک درہ نہایت تنگ پڑتا ہے اور سڑک بھی زیادہ چوڑی نہیں ہے، ٹیکسی چلانے والے عرب شوفروں کو ایک دوسرے سے موٹر آگے نکال لینے میں بڑا مزا آتا تھا، اور مجھے بار بار "اصبر اصبر یا شیخ" کہنا پڑتا تھا، ورنہ بظاہر یقیناً دو ایک بار تصادم ہو جاتا۔

یاسین خان کے پاس سے واپس آکر ساحل کے تار گھر سے گھر کو تار دیا کہ اب تک بحری سفر بہت اچھی طرح گزرا، اور اب تو "مانسون"[1] کی جولانگاہ ہی ختم ہو چکی تھی۔ اس لئے باقی سفر کے متعلق، کم از کم بندر سعید تک تو اطمینان تھا، جہاز پر آکر لنچ کھایا، روانگی کے تین چار گھنٹے انتظار کیا، اس لئے کہ ایک کواڑ جہاز میں کہیں ٹوٹ گیا تھا جسے مرمت کے لئے اسے ساحل پر بھیجا گیا تھا، اور وہ چھ بجے کے قریب آیا تو لنگر اُٹھایا گیا۔ اس عرصہ میں تاجر (زیادہ تر یہودی) فروخت کے لئے کشتیوں میں سامان لاکر بیچنے لگے۔ حج و زیارت و مؤتمر سے واپسی کے وقت میری بیوی نے انہی لوگوں سے بہت سی جانمازیں خریدی تھیں، اور مجھے ان کا تجربہ تھا کہ جو قیمت مانگتے ہیں اس سے نصف سے کم پر بالآخر اُسے خوشی بخوشی فروخت کر دیتے ہیں۔ میں دس دس روپیہ میں تین تین مخملی جانمازیں خرید چکا تھا جو عام طور پر ہندوستان میں پانچ پانچ، ساڑھے چار چار روپیہ میں ملا کرتی ہیں۔ اس بار دسیوں مصلے خریدے تھے، جی چاہا کہ ایک خوشنما بڑا مصلّٰے خرید لوں تاکہ اگر لندن یا پیرس میں اتنے نمازی مل جائیں کہ نماز جماعت ہو سکے (جس کی زیادہ امید نہیں) تو بجائے چادر کے اسی مصلّٰے پر نماز جماعت پڑھی جا سکے، ورنہ یوں تو قطب[2] میاں صاحب کا عطاء کیا ہوا ایک ادنیٰ قالین کا مصلّٰے میرے پاس تھا، گو خود تو میں اسی مخملی مصلے پر نماز پڑھا کرتا ہوں جو میرے مرحوم ماموں صاحب اپنے لئے ۱۹۰۱ء میں حج سے لائے تھے، اور جسے میں نے ان سے زبردستی چھین لیا تھا۔ انہوں نے فرمایا تھا کہ میاں یہ چیز تمہارے کس کام کی، یونہی پڑی رہے گی، جس سے مجھے سخت غیرت آئی تھی، لیکن الحمدللہ کہ اسلامی ممالک کے مصائب نے مجھے نماز پڑھنا سکھا دیا، اور درحقیقت مسلمان بنا دیا۔ اسی مصلّٰے پر نماز شروع ہوئی، اور گو سجدہ کا نشان میری

---

[1] بارش لانے والی موسمی ہوائیں [2] فرنگی محل کے ایک بزرگ

جبین پر اب تک نہیں پڑا، لیکن میری ایڑیوں نے اس مصلے پر چھید کر دیئے ہیں۔ یہودی نے اس بڑے مصلے کے تیس روپیہ مانگے تھے۔ میں نے تین دینا چاہے اور بالآخر تیرہ[۱۳] روپیہ آٹھ آنہ یعنی ایک پونڈ پر معاملہ طے ہو گیا۔ یہ بڑا مصلیٰ چھوٹے چار مصلوں کے برابر ہے، اور محراب اور روشنی کا جھاڑ اور بیل وغیرہ نہایت خوشنما ہیں، اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ سودا بُرا نہیں ہوا۔ بہر حال وقت خوب کٹ گیا ورنہ عدن کو جو یقیناً جزیرۃ العرب میں شامل ہے، کفار کی زیرِ حکومت دیکھ کر قلب کی جو کیفیت ہوتی تھی وہ قابلِ بیان نہیں۔

دوسرے دن یعنی ۸ کو رات کے وقت معلوم ہوا کہ ٹامس کک کی کمپنی مسافروں کو سویرے سے قاہرہ موٹروں میں لے جاتی ہے، دن بھر قاہرہ کی سیر کراتی ہے۔ اور اہرام مصر اور اسفنکس[۱] (ابوالہول) وغیرہ دکھاتی ہے، اور شام کے چھ بجے کی گاڑی میں سوار کر کے دس ساڑھے دس بجے بندر سعید پر جہاز کی روانگی سے ایک دو گھنٹہ قبل پہنچا دیتی ہے حالانکہ ۱۹۱۳ء میں جب سید وزیر حسن صاحب اور میں مسجد کانپور، "ایڈریانوپل" اور "ٹمر کیدیہ" کے مقدمہ کے سلسلہ میں ولایت گئے ٹامس کک کی کمپنی اس قسم کے EXCURSION کا کوئی انتظام نہیں کیا کرتی تھی، تاہم ہم دونو اور چند ہندوستانی سویز سے ریل پر قاہرہ گئے تھے۔ اور بڑے مزے سے اہرام وغیرہ دیکھ کر آئے تھے۔

اس بار فراعنہ کی قبروں کے دیکھنے کا شوق ہرگز دامنگیر نہ تھا، مگر مصری احباب سے ملنے کو دل تڑپ رہا تھا۔ میں دہلی سے ڈاکٹر احمد[۲] فواد اور ڈاکٹر عبدالحمید[۳] سعید کے

---

[۱] قاہرہ سے چند میل کے فاصلے پر اہرام مصر کے پاس ہی ابوالہول کا بت ہے۔ اس کا دھڑ شیر کا اور چہرہ آدمی کا ہے۔ بت کیا ہے، ایک پہاڑ کا پہاڑ ہے۔ قدیم مصری ابوالہول کی پرستش کرتے تھے۔ [۲] و [۳] اگلے صفحہ پر دیکھیں

کو خط لکھ چکا تھا جس میں میں نے تحریر کیا تھا کہ بہت جی چاہتا ہے کہ ہفتہ عشرہ مصر میں قیام کروں، لیکن وہاں کا مطلع نہایت گرد آلود ہے، اور ہائی کمشنر صاحب ہمارے جیلر لارڈ جارج لائیڈ صاحب ہیں، اس لئے مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ اس وقت اترو ں اور مصری بھائیوں کی مشکلات میں کسی اضافہ کا سبب بنوں البتہ اگر چند دوست تکلیف گوارا فرما سکیں تو بندر سعید پر اتر کر مل لیں، یا سویز سے ہمارے ہی جہاز پر سوار ہو کر بندر سعید تک ساتھ ساتھ چلے چلیں جب ۱۹۲۶ء میں حج بیت اللہ و زیارت روضۂ اقدس و موتمر عالم اسلام کی شرکت کے لئے بمبئی سے روانہ ہوا تھا تو انہی دونوں صاحبوں کو تار سے اطلاع دے کر حجاز آنے کی دعوت دی تھی۔ یہ غلطی سے سمجھے کہ ہم لوگ سویز کے راستہ سے جا رہے ہیں۔ اس لئے ایک بڑی جماعت ہم سے ملنے کے لئے سویز آکر مایوس واپس ہوئی تھی۔ میں نے لکھ دیا تھا کہ اس بار غلط فہمی نہ ہوگی۔ انشاء اللہ ۲ رجون کے جہاز میں سوار ہو کر غالباً ۱۱ رجون کو سویز پہنچونگا۔ جب ۸ ر کو معلوم ہوا کہ میں دن بھر کے لئے سویز سے قاہرہ جا سکتا ہوں تو فوراً اُن کو تار دیئے اگر ممکن ہو تو اپنی ذاتی موٹریں لے کر سویز ہی آجائیں اور تار سے فوراً اطلاع دیں۔ ورنہ کک کمپنی کے موٹروں میں قاہرہ پہنچ کر ان سے ملونگا۔ ان کی موٹریں اس لئے منگائی تھیں۔

پچھلے صفحے سے ۲؎ ڈاکٹر احمد فواد مرحوم مصر کی حزب الوطن کے ایک سرکردہ رکن تھے مرحوم نے قومی جدوجہد کے سلسلہ میں بڑی تکلیفیں اٹھائیں جنگ بلقان اور جنگ عظیم میں ترکوں کے پہلو بہ پہلو شریک رہے، آخر میں مصر میں واپس آگئے تھے۔ مولانا مرحوم سے بہت محبت تھی اور مصر میں ہندوستانی طلبہ کی بھی بڑی مدد کرتے تھے۔ ۳؎ حزب الوطن کے نائب صدر، یہ بھی ڈاکٹر احمد فواد کے ساتھیوں سے تھے۔ آخر میں آپ نے جمعیت شبان المسلمین کی بنا رکھی اور تا عمر اُس کے صدر رہے۔ مرحوم کا ابھی کچھ عرصہ ہوا انتقال ہوا ہے + ۱؎ بمبئی کے گورنر رہ چکے تھے۔

کہ تین ساڑھے تین گھنٹے جو موٹریں کٹنے والے تھے وہ رائیگاں نہ جائیں۔ راستہ بھر اپنی داستانِ غم انہیں سناؤں اور اُن کا دردِ دل ان سے سنوں۔ بحر احمر میں گرمی زیادہ ہوتی ہے، اور ہوا کم، پسینوں پر پسینے آیا کرتے ہیں۔ الا ماشاء اللہ۔ اس مرتبہ بھی " الا ماشاء اللہ " کا ثبوت ملا، اور نہایت خوشگوار ہوا سارے سفر میں چلتی رہی مگر چونکہ ۸ کے تار کا جواب نہ ۹ کو ملا نہ ۱۰ کو۔ اس لئے سارا لطف گندھیر ہو گیا (نہ معلوم یہ لفظ اُردو ہے یا پشتو۔ رامپور میں ضرور استعمال ہوتا ہے اور مطلب کو خوب ادا کرتا ہے) ۹ کی رات کو جہاز والوں نے انتظار کر کے بالآخر کہہ دیا کہ اب ہم کو کُک کو تار دینا ہے اس لئے فیصلہ کیجئے کہ ان کے ساتھ جائیگا یا خود اپنا انتظام کیجئے گا۔ مجبور ہو کر کُک ہی کے ذریعہ انتظام کرایا۔ جب ۱۰ کو بھی تار کا جواب نہ آیا تو خیال کیا کہ اچھا ہوا کہ کُک کے ذریعہ جانے کا انتظام کر لیا۔ لیکن اب یہ تشویش شروع ہو گئی کہ کہیں مصر کی سیاسی صورت حالات بد سے بدتر نہیں ہو گئی، اور کہیں ہمارے احاطہ بمبئی کے سابق گورنر صاحب نے جو میرے جیل سے لکھے ہوئے خطوط کو خود سنسر کیا کرتے تھے، میرے تار کو تو یہاں بھی سنسر نہیں کر لیا۔

جہاز پہ ایک نہایت خوبصورت، خوب سیرت چھوٹی سی لڑکی ہے جس کی والدہ کی کرسی میری کرسی کے قریب ڈیک پر رہتی ہے۔ اس سے کئی بار باتیں ہو چکی تھیں وہ نوشہرہ آٹھ برس رہ چکی تھی، اور سال ڈیڑھ سال سے پشاور میں رہتی ہے۔ ایک دن اس کی زبان سے یکایک معلوم ہوا کہ اس کے والد افغان ہیں۔ مجھے سخت حیرت ہوئی، اور اس کی والدہ سے پوچھا۔ تب جا کہ معلوم ہوا کہ وہی میم صاحبہ ہیں جن کا نام مسافروں کی فہرست میں پڑھ کہ ہمیں خوب ہنسی آئی تھی۔ اس لئے کہ ان کا اسم گرامی " مسز صاحب " اس فہرست میں

درج تھا۔ اب معلوم ہوا کہ ان کے شوہر کا نام "کپتان خان صاحب" ہے اور وہ آئی۔ایم۔ایس (.I.M.S) میں تھے، مگر انہوں نے ۱۹۲۱ء میں ترک تعاون کیا اور اپنے عہدہ سے مستعفی ہو گئے۔ اب تو حیرت کی انتہا نہ رہی، کیونکہ ایک ایسے شخص سے میرا ناواقف ہونا سخت تعجب کی بات تھی۔ کل جا کر معلوم ہوا کہ یہ ہمارے عزیز اور محترم دوست عبدالغفار خان اوتمانزئی کے بڑے بھائی تھے، اور مریم (یہ اس لڑکی کا نام ہے) صرف انہی کی بھتیجی نہیں نکلی، بلکہ میری بھی بھتیجی نکلی۔ اس امید پر کہ میرے دوست موٹریں ضرور بھیجیں گے۔ میں نے مریم کو بھی قاہرہ چلنے کی دعوت دی تھی مگر اس کی والدہ نے اس سے کہا کہ میرے پاس اتنا روپیہ نہیں ہے کہ تجھے قاہرہ بھیجوں۔ اگر تار کا جواب آ گیا ہوتا تو میں کہہ دیتا کہ روپیہ مطلق صرف نہ ہوتا۔ صرف قاہرہ سے بندر سعید تک میں خود اسے نصف ٹکٹ خرید کر لے آتا مگر تار کا جواب نہیں آیا اور ریاست الور کے وزیر اعظم، راؤ گردھاری لعل صاحب نے ساتھ چلنے کا ارادہ فسخ کر دیا اور عقیل بلگرامی صاحب کی طبیعت بھی ناساز ہو گئی اور دہلی کے لیڈی ہارڈنگ میڈیکل کالج میں کیمبرج کی گریجوایٹ کیمیا پڑھانے والی مس رام صاحبہ کے ساتھ جانے والی ڈاکٹر مس گلکرسٹ نے بھی اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ میرے سوا اب صرف مس رام صاحبہ (جن کے والد انگلستان میں معالج ہیں اور جن کی والدہ بھی وہیں ہیں) اور مشہور سالٹروں کی فرم "کپتان اور ویڈ" کے ویڈ صاحب اور قاسم علی منجی صاحب (جنہیں ہم مسلمانوں کا "ڈاکٹر مونجے" کہتے ہیں) رہ گئے، اور ہم سب نے کک کو روپیہ دے کر ٹکٹ خرید لئے۔ اس پر بھی متردد تھا کہ کہیں مصر کی سیاسی صورت حالات کے باعث میرے پاسپورٹ کا "ویزا" کرنا نامنظور نہ کیا جائے۔

اسی فکر میں ۱۰ ارکا دن بھی کاٹا، اور بالآخر اپنا بکھرا ہوا اسباب درست کیا۔

(اس لئے کہ اب تک صرف میں ہی اس کمرے میں تھا، اب ہزہائنس نواب صاحب پالن پور کے ہمرکاب دو صاحب پورٹ سعید سے سوار ہونے والے تھے) اور کمرے میں ان کے سامان کے لئے جگہ نکالنی مشکل تھی۔ کپڑوں کا ایک جوڑا ایک چھوٹے سے صندوق میں، جس میں کاغذات بھرے تھے، کاغذات کو نکال کر رکھا۔ اور سب کاموں سے فارغ ہو کر نماز عشاء میں مشغول ہوا۔ فرض پڑھ ہی چکا تھا کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو ایک اسٹیورڈ (Steward ۔ جہاز کا نوکر) ریڈیو گرام (لاسلکی) لئے کھڑا تھا۔ ڈاکٹر احمد فواد کا تار (یا "بے تار"؟) تھا کہ میں موٹریں لے کر خود سویز آرہا ہوں۔ خدا کا شکر ادا کیا اور اس کے بعد اطمینانِ قلب کے ساتھ سونے کو لیٹا مگر بے اختیار جی چاہا کہ پاس ہی کمرے میں مریم کی والدہ ہیں انہیں جا کر جگاؤں اور دعوت دوں کہ مریم سمیت ہمارے ساتھ قاہرہ چلیں۔ بالآخر یہ تو نہیں کیا، مگر راڈ گر دھاری نعل صاحب کو جا دبوچا۔ کہ بھائی اب تو دو موٹریں آرہی ہیں، اب تو چلو مگر انہیں صبح کے چار بجے اٹھنا ہرگز قبول نہ تھا۔ میں نے بہت ہی اصرار کیا، مگر وہ معذرت ہی کرتے رہے اور آخر کار ۱۱ بجے میں بھی جا کر سو رہا مگر صبح ہی کو اٹھنے کی فکر تھی، بیچاری مس رام صاحبہ خائف تھیں کہ کہیں سوتی ہی نہ رہ جائیں۔ اس لئے میں نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ کسی نہ کسی کو ان کے کمرے کی طرف بھیج کر ان کو علی الصباح اٹھوا دوں گا۔ خدا ذیابطیس کا بھلا کرے، چار بجے سے پہلے ہی آنکھ کھل گئی۔ مگر چونکہ اب تک جہاز لنگر انداز نہ ہوا تھا، اس لئے پلنگ پر لیٹ رہا۔ جب وہ لنگر انداز ہونے کے قریب معلوم ہونے لگا۔ تو حوائج ضروری سے فارغ ہو کر غسل کیا۔ کپڑے بدلے اور نماز فجر پڑھی۔ کچھ بمبئی سے لائے ہوئے آم بچ رہے تھے ۔

عرفان صاحب نے اتنے زیادہ خرید دیئے تھے اور بہار کے آغا صاحب نے اتنے مرحمت فرما دیئے تھے کہ خود ختم نہ کر سکتا تھا۔ کچھ مسز برج محل نہرو کی ہمشیرہ صاحبہ کو، جو راجہ نریندر ناتھ صاحب کی صاحبزادی ہیں اور اپنے شوہر کے ساتھ اپنے مریض صاحبزادہ کو دیکھنے ولایت جا رہی ہیں اور کچھ سر ہری سنگھ گور ایم۔ایل۔اے کی صاحب زادی مسز ورت صاحبہ کو بھیج چکا تھا، کچھ نوکروں کو دیئے تھے اور چونکہ ۱۱ کو یقیناً سڑ جاتے، اس لئے ارادہ تھا کہ چلتے وقت انہیں بھی کسی کو دے دوں لیکن اب توجی میں ٹھانی کہ انہیں قاہرہ والوں کو چل کر کھلاؤں۔ ڈیک پر آیا تو زینہ پر مس رام صاحبہ اپنے "پیراسول" (چھتری) اور اٹیچی کیس، اور ہینڈ بیگ سمیت ملیں، اور جلد ہی اور ہندوستانی مرد اور عورتیں اور بچے سب آگئے۔ پاسپورٹ پڑھ "ویزا" کرنے والے مصری افسر بھی آگئے۔ کُک کا آدمی بھی آگیا اور اس نے تاکید کی کہ جلد اسٹیم لانچ میں سوار ہو جاؤ، میں پاسپورٹوں پر ویزا کرا کے ابھی آتا ہوں اور ہم فوراً چل دینگے۔ جہاز والوں نے بھی کہہ دیا تھا کہ جہاز کے رکتے ہی طبی معائنہ کرنے والے آجائینگے اور گھنٹہ بھر بعد جہاز چھوٹ جائے گا۔ ہمیں خود بھی جلدی تھی کہ جتنی جلد یہاں سے روانہ ہونگے اتنی ہی جلد قاہرہ پہنچ جائینگے اور اتنا ہی زیادہ وقت وہاں کے قیام کے لئے ملیگا۔ ہم پانچ بجے ہی اسٹیم لانچ میں سوار ہو گئے مگر دیر تک ان مسافروں کا سامان لانچ میں سے اُترتا رہا جو سویز سے جہاز پر سوار ہوئے تھے۔ جب یہ بھی ہو چکا تو کُک کے "خضر راہ" کی تلاش شروع ہوئی۔ بڑی مشکل سے ان کا پتہ چلا، مگر وہ لانچ میں آتے ہی پھر جہاز پر چڑھ گئے اس لئے کہ اب تک قاہرہ جانے والے انگریزوں میں سے ایک بھی جہاز پر سے نہ اترا تھا اور جب اور بھی دیر لگی تو ہم نے قیاس کیا کہ یہ حضرات غالباً ناشتہ تناول فرما رہے ہیں۔ حالانکہ ہمارے ساتھ کی عورتوں اور بچوں تک نے نہ کچھ کھایا تھا نہ پیا تھا۔ میں نے کھانے کے کمرے

کے اسٹیورڈ سے رات ہی کو کہہ دیا تھا کہ ہمیں کچھ انڈے اور کچھ روٹی مکھن صبح کی چائے کے ساتھ دے دینا، مگر نہ چائے کا پتہ تھا اور نہ روٹی مکھن کا نہ اسٹیورڈ کا جی چاہا کہ جہاز پر چڑھ جائیں اور ہم بھی صاحب لوگوں کے ساتھ ناشتہ کر لیں۔ مگر خوف ہؤا کہ کہیں ٹکٹ کا خضر راہ نہ آجائے اور ہمیں جہاز ہی پر چھوڑ کر خود صاحب لوگوں کے ساتھ ساحل کی طرف روانہ نہ ہو جائے۔ جب سید وزیر حسن صاحب کے ہمرکاب ہیں ۱۹۱۳ء میں اسی طرح سویز سے قاہرہ گیا تو ایک صاحب بہادر، کو جہاز کا لنچ اس قدر پسند آیا تھا کہ انہوں نے ڈیڑھ دو بجے تک لانچ میں نزولِ اجلال نہ فرمایا تھا، حالانکہ ہم بارہ بجے سے آئے ہوئے بھوکے بیٹھے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہؤا کہ جب ہم ساحل پر پہنچے تو معلوم ہؤا کہ ریل گاڑی چھوٹ چکی، سیولئے ہوٹل" نام کے ایک ہوٹل یا ریسٹوران" میں ہم کو موٹروں میں بیٹھ کر لنچ کھانے کے لئے کئی میل دُور جانا پڑا تھا، اور باوجودیکہ لنچ کی قیمت لندن کے مشہور "سیولئے ہوٹل" سے کم نہ تھی، مگر کھانا اتنا کم اور اتنا خراب ملا تھا کہ خدا کی پناہ، جب اس سے فارغ ہوئے تھے تو تین گھنٹہ سویز کی گلیوں اور بازاروں میں گھومنا پڑا تھا، اس لئے کہ اب گاڑی چھ بجے شام سے پہلے چھوٹنے والی نہ تھی۔ بازار میں بیٹھ کر تربوز کھانے شربت پینے اور ترکی ٹوپیاں درست کروانے کے سوائے کوئی کام نہ تھا۔ عبدالرحمٰن صدیقی۔ شعیب۔ اور خلیق وغیرہ۔ چونکہ ڈاکٹر انصاری اور کمر یڈ کے طبی وفد کے ممبروں کی حیثیت سے دورانِ جنگ میں سخت مصروف رہے تھے۔ اور ترکی کی مطلق سیر نہ کر سکے تھے۔ اس لئے جب ہم جولائی کو ڈاکٹر انصاری صاحب معہ دیگر اراکین وفد کے بمبئی واپس آئے تھے تو یہ اصحاب ثلاثہ ہمراہ نہیں آئے تھے، سیر کرنے کے لئے ان کو کچھ دنوں کے لئے قسطنطنیہ ہی میں چھوڑ دیا گیا تھا۔ مگر اس عرصہ میں بلقانی اتحادیوں میں پھوٹ پڑ گئی تھی، اور خود ان کے درمیان آتش جنگ مشتعل ہو گئی

تھی، جس سے پورا نفع اُٹھا کر انور پاشا رحمۃ اللہ علیہ[1] نے ایڈریانو پل فتح کر لیا تھا
اور پہلی ہی ریل گاڑی میں یہ اصحاب ثلاثہ اور نہ جا پہنچے ہوئے تھے۔ ۱۴ ستمبر
کو واپس آ گئے تھے۔ اور ہم ۱۶ ستمبر کو بمبئی سے سوار ہوئے تھے۔ انہوں نے ہمیں
اطلاع دی تھی کہ حمیدیہ سویز میں لنگر انداز ہے، وہیں رؤف بک[2] سے نیاز حاصل
ہو جائے گا، اس لئے ہیں طبی وفد کی وردی پہنے جہاز سے اترا تھا تاکہ حمیدیہ
والے اسے پہچان کر ہمیں جہاز پر آنے دیں، باقی تعارف حمیدیہ پر سوار ہونے
کے بعد ہوتا رہیگا۔ سویز پہنچ کر معلوم ہوا کہ حمیدیہ تو روانہ ہو چکا مگر ایک
Gun Boat سویز میں لنگر انداز ہے۔ ہم کشتی میں سوار ہو کر اس تک گئے
تھے، اور وہاں سب ہندوستانیوں کا بڑے تپاک سے استقبال ہوا تھا۔
اور پہلی بار ہندوستانیوں نے ایک جنگی کشتی کی توپیں اور "ٹورپیڈو" اور
گنیں وغیرہ دیکھی تھیں۔ چھ بجے ہماری گاڑی چھوٹی تھی، اور گیارہ بجے قاہرہ
پہنچنے والی تھی۔

ہم نے ہندوستان پر سے قیاس کیا کہ بھلا آدھی رات کو قاہرہ میں
سوائے اندھیرے کے اور کیا ہو گا۔ سب پڑے ہوتے سوتے خراٹے لیتے
ہونگے۔ مگر جب ہم اسٹیشن پر پہنچے تو چراغاں نظر آیا تھا اور بازاروں میں
گیارہ بجے رات کے وہ رونق تھی جو کلکتہ اور بمبئی تک میں شام کو بھی نہیں
ہوتی۔ اس لئے ہم نے شیپرڈ ہوٹل پہنچتے ہی ایک خضر راہ کو ساتھ لیا تھا اور

[1] مشہور و معروف ترکی نہیم۔ جنگ عظیم میں سلطنت ترکیہ کے وزیر جنگ تھے۔ آپ
تحریک پان اسلازم کے بڑے داعی تھے۔

[2] ترکی کے ایک نامور جرنیل۔ مصطفےٰ کمال کے ساتھ یونانیوں سے لڑے۔ ایک
بار جامعہ میں تشریف لائے اور "ترکی" پر چند تقریریں کیں۔

قاہرہ کی "نائیٹ سائڈ" (Night Side) کی خوب ہی سیر کی تھی، گو اس سلسلہ میں ہوٹل کے ترجمان صاحب کو "خضر راہ" کا لقب دینا ایک گناہ عظیم سے کم نہیں معلوم ہوتا۔ صبح کے تین بجے تک بازاروں میں چہل پہل رہی تھی اور ہم سیر کرتے پھرتے تھے۔ ایک جگہ محفل رقص و سرود گرم تھی، اور ایک لحیم شحیم خاتون جو بظاہر قاہرہ کی گوہر جان تھیں ناچ اور گا رہی تھیں۔ ہم نے آج تک عربی میں سوائے قرآن کریم کے سنا ہی کیا تھا؟ جب اس خاتون کے تھرکنے پر بار بار سامعین اور ناظرین کے مجمع میں سے لوگوں نے "قلتبنی یا ستی" (جس کو اردو میں "ہائے جانی مار ڈالا" ہی کے جملے سے ادا کیا جا سکتا ہے کہنا شروع کیا) تو کم از کم مجھے تو سخت حیرت ہوئی تھی۔ جب ہم تین بجے صبح کے ہوٹل پہنچے، تو مجھے خیال ہوا کہ اگر اسی وقت موٹر مل جائے تو جیزہ[1] جا کر اہرام اور اسفنکس (ابوالہول) بھی دیکھ آئیں، اگر اس وقت سو گئے تو صبح کو اٹھنا محال ہے، تو پھر کون چودہ میل جائیگا اور چودہ میل واپس آئیگا؟ چنانچہ اسی وقت موٹر لیکر ہم جیزہ گئے تھے اور واقعی اس سے بہتر وقت بھی اس کام کے لئے نہیں ہو سکتا تھا۔ جب وقت ہم نے اسفنکس کو دیکھا تو ایک طرف سورج نکل رہا تھا اور دوسری طرف چودھویں کا چاند ماند جلد ہی پڑنے والا تھا۔ جیزہ سے واپس آکر صرف غسل کرنے اور ناشتہ کرنے کا وقت باقی تھا اور شیپرڈ ہوٹل میں صبح نو بجے سے پہلے نہ ہوتی تھی۔ بڑی مشکل سے ساڑھے نو بجے تن تنہا "حاضری" کھا کر ہم "الشعب" اخبار کے دفتر کو روانہ ہوتے تھے (اللوا اس زمانے میں اس نام سے نکل رہا تھا)۔ مساجد اور جامع الازہر کے دیکھنے تک کا وقت نہ تھا۔ صرف "الشعب" کے ایک انگریزی داں سب اڈیٹر سے ملاقات ہو سکی

---

[1] دریائے نیل کے دوسرے کنارے قاہرہ کے مقابل میں یہ بستی آباد ہے۔

تھی اور گیارہ بجے پورٹ سعید کی طرف جانے والی گاڑی میں سوار ہو کر روانہ ہونا پڑا تھا تاکہ ۳ بجے شام کے جہاز پر سوار ہو جائیں اور مغرب سے پہلے لنگر اٹھ جائے اور ہم یورپ کا رُخ کریں۔ یہ سب اس وجہ سے ہوا تھا کہ ایک صاحب بہادر کو جہاز کا لانچ بہت عزیز تھا۔ اس بار صاحب لوگوں کو جہاز کی چاء بہت عزیز معلوم ہوتی تھی۔ اور گھنٹہ بھر انتظار کرنے پر بھی ایک صاحب کا پتہ نہ لگتا تھا یا رہبار گک کے خضر اِن راہ جہاز پر چڑھتے تھے اور پھر اُتر کر لانچ پر آتے تھے۔ آخر بار اُترے تو کہا ابھی ایک صاحب بہادر غسل فرما رہے ہیں۔ اب تو ہم سے نہ رہا گیا اور میں نے کچھ کھانے کا مطالبہ کیا۔ کھانے کے کمرے کا ہیڈ اسٹیوڈ بہت معقول آدمی ہے دوڑا ہوا آگیا اور کچھ نارنگیاں اور کچھ سیب کچھ بسکٹ اور سب کے آخر میں کچھ گوشت کی سینڈوچیں بھی لے آیا۔ ان سب پر میں نے قبضہ کیا اور بالآخر چھ بجے ہم لوگ لانچ پر ساحل کی طرف روانہ ہوئے۔ ایک کشتی پر ہر طرف رنگ برنگ کی جھنڈیاں آویزاں تھیں اور باجہ بج رہا تھا۔ ایک جہاز بھی اسی طرح آراستہ تھا۔ ساحل پر ایک طرف پولیس والے وردیاں پہنے کسی کے استقبال کے لئے صف بستہ کھڑے تھے۔ معلوم ہوا کہ ہارون بے رئیس بلدیہ حج بیت اللہ سے اسی جہاز میں واپس آئے ہیں جو آراستہ کھڑا ہے اور آراستہ کشتی میں لوگ انہیں کو لینے آئے ہیں۔ اس سے پہلے ہمارے ساتھی مسٹر وید نے مذاقاً کہنا شروع کر دیا تھا کہ مولانا یہ سب آپ کا استقبال ہے۔ میں نے کہا کہ مجھے یہاں کوئی نہیں جانتا لیکن چند ہی منٹ میں معلوم ہوا کہ نہیں، کچھ لوگ یہاں بھی میرے خط و خال سے واقف ہیں، اس لئے کہ ہمارے اسٹیم لانچ کے ایک مصری افسر نے مجھ سے پوچھا کہ آپ شوکت علی محمد علی تو نہیں ہیں۔

اب میں اس طول طویل خط کو ختم کرتا ہوں۔ انشاء اللہ مارسیلز سے جو خط ڈالا جائیگا اُس میں ڈاکٹر احمد فواد بے سے ساحل سویز پر ملاقات اور اُن کے ساتھ قاہرہ تک سو سوا سو میل کے موٹر کے سفر، اور قاہرہ میں سات گھنٹہ قیام، مزار حضرت امام حسینؓ[1] پر جا کر فاتحہ پڑھنے، جامع الازہر جانے اور وہاں کے مکتبہ اور درسگاہوں کی سیر کرنے، رسّل پاشا کمشنر پولیس[2] کے مجھے CONTINENTAL HOTEL میں میرے میزبان ڈاکٹر عبدالحمید سعید بے[4] کے ساتھ دیکھکر اور پوچھنے پر کہ یہ کون ذاتِ شریف ہیں اور یہ معلوم کرنے پر کہ مولانا محمد علی "یکے از علی برادران ہوں" حیرت زدہ رہ جانے کہ یہ شخص مجھے اطلاع ہوئے بغیر قاہرہ تک آپہنچا۔ عبدالحمید سعید بے کے مکان پر ایک پر تکلف دعوت کھانے اور مصری زعماء سے نیاز حاصل کرنے، اپنے رفیق اکسفرڈ محمد پاشا محمود وزیر مال سے ملاقات کرنے۔ شیخ شاویش سے گھنٹہ بھر تک دل کھول کر باتیں کرنے جمعیت شبان المسلمین کے مرکز میں جانے اور مصری نوجوانوں سے ملنے اور اپنے خیالات ان پر اسی طرح ظاہر کرنے جس طرح زعمائے مصر کے سامنے ابوبکر پاشا جج بعدالت عالیہ کے ارشاد

---

[1] جامع ازہر کے پاس ہی جامع حسینی ہے اس میں حضرت امام حسینؓ کا مزار بتایا جاتا ہے مصر کے فاطمی خلفاء کے عہد میں تبرکاً یہ مزار بنا دیا گیا۔

[2] مصر کی پولیس کے سب سے بڑے افسر، یہ انگریز ہیں اور مصری حکومت نے ان کو پاشا کا خطاب دیا ہے۔ [3] مصر کی لبرل پارٹی کے لیڈر تھے، دو بار وزیر اعظم بھی بنے۔

[4] ڈاکٹر فواد، ڈاکٹر عبدالحمید سعید کے ساتھیوں میں سے تھے، عربی زبان کے بے مثل ادیب اور شعلہ بیاں مقرر تھے۔ انور پاشا کے دست راست کی حیثیت سے بڑے بڑے کام کئے۔ آخر عمر مصر میں واپس آ گئے تھے اور وہیں انتقال فرمایا۔

فرمانے پر عبدالمجید سعید بے کے مکان پر ظاہر کئے تھے، ہندوستانی طلباء[1] الازہر سے ملنے اور ان کے اور الازہر کے ایک بڑے عالم شیخ زنکلونی کے مجھے اسٹیشن تک رخصت کرنے کے لئے تشریف لانے اور شیخ قاضی ابوالعزائم[2] کے صاحبزادے اور اپنے رفیق سفر حج اور ہمارے معزز ترجمان کے ہمارے استقبال نیز ہماری مشائعیت کے لئے ان کے حکم سے تشریف لانے، گلاب کے پھولوں کے ایک خوشنما اور خوشبودار گلدستہ کو ہندوستانی علبہ کی طرف سے پانے اور بالآخر قاہرہ سے ایک عجیب کیفیت کی حالت میں رخصت ہونے کا حال انشاءاللہ جلد لکھا جائے گا، اس کا انتظار کیجئے اور اپنی صحت اور ہمدرد کی کامیابی کی دعاء جو مانگ رہا ہوں پر آمین کہئے۔

پورٹ سعید آکر ہز ہائینس نواب صاحب پالن پور اور ان کے ساتھ ٹھاکر صاحب لمبیڈی کے صاحبزادے سے ملاقات ہوئی اور جب ایک بجے کے بعد جہاز میڈی ٹرینین بحیرہ روم، میں اتنی دور چلا آیا۔ کہ راہنما روشنیاں سب پیچھے رہ گئیں تو میں اپنے کمرے میں گیا اور نماز عشا پڑھکر ہندوستان کی آزادی اور تمام دنیا کی آزادی کی دعاء کر کے سونے لیٹ گیا۔

سمندر میں کسی قدر جوش ہے، مگر الحمدللہ کہ سورج نکلا ہوا ہے۔ اور بارش نام کو نہیں ہے۔ موسم نہایت خوشگوار ہے اب جہاز کے متعدد انگریز مسافر بھی نہایت تپاک سے ملتے ہیں بعض سے دیر تک سیاسی مسائل پر گفتگو بھی خوشگوار طریقہ پر ہوتی ہے۔ ایک صاحب نے جو پنجاب سول سروس میں تھے۔ اور اب بیکانیر میں ہیں اور

---

[1] آپ کا آزادخیال علماؤں سے شمار ہوتا تھا۔ قرآن مجید پر بڑا عبور تھا۔ مرحوم شیخ عبدہ کے شاگرد تھے،

[2] مصر کے ایک اہل طریقت بزرگ، خلافت کے احیاء کے بڑے داعی تھے،

جن کا نام مسٹر Rudkin ہے مصنّف LOST DOMINION کی تازہ ترین تصنیف GARDEN OF ADONIS پڑھنے کو دی ہے جسے تقریباً ختم کر چکا ہوں۔

اب مالٹا کا ساحل قریب ہے خط بند کرتا ہوں۔ پہلی بار P.O. کے جہاز Wealth سے سوار ہو کر جا رہا ہوں اس لئے خط کو یہیں سے ڈالنے کا موقعہ مل گیا۔ پرسوں انشاء اللہ مارسیلز پر جہاز لنگر انداز ہوگا میں نے سوائے آپ دو حضرات کے یہاں سے کسی کو خط نہیں لکھا ہے میرے گھر میں خیریت کہہ دیجیئے گا اور نیز شوکت علی صاحب اور عرفان صاحب کو لکھ دیجیئے گا۔

آپ کا دعاگو

محمد علی

---

(۷)

قاہرہ میں ایک دن

۵۱- کیونڈش روڈ کلیپہیم پارک

لندن- ایس- ڈبلیو ۱۲ - ۱۸ جولائی

پیارے ماجد میاں و ظفر الملک جعفری- السلام علیکم و رحمتہ اللہ و برکاتہٗ

امید کہ گذشتہ ہفتوں میں.... بیگم صاحبہ اور مولینا عرفان کے نام کے خطوط سے آپ کو میرے متعلق کافی اطلاع مل گئی ہوگی- آج ایک ماہ اور ایک ہفتہ کے بعد ۱۱ جون کی داستان، جہاں اسے مالٹا کے قریب لکھتے ہوئے خط میں چھوڑا تھا! پھر شروع کرتا ہوں- ابھی ایک عزیز کرمفرما کا جنہیں بظاہر میری مصروفیتوں کا ابھی تک مطلق تجربہ نہیں، خط آیا ہے جس میں نہایت اصرار سے درخواست کی گئی ہے کہ جس طرح میں نے ماجد میاں "شرکار" کو بہت دلچسپ اور بہت طویل خط لکھا ہے، اسی طرح "ہفتہ میں کم از کم ایک خط" انہیں بھی لکھا کروں- شاعری کی طرح دلچسپ اور طویل خط لکھنا کار بیکاراں است- جہاز میں سوائے خط لکھنے کھانے و سونے کے اور مشغلہ ہی کیا تھا لیکن اب ڈاکٹر سے ہفتہ میں تین بار ملاقات ہوتی ہے، جو گھنٹہ بھر تک رہتی ہے- اس لئے یہاں سے تیار ہو کر جانا "زیرِ زمین ریل یا "آہنی بس" (یعنی سب کے لئے" یا میری اصطلاح میں غریب پرور) یا ٹرام کا سفر پھر چورا ہہ پہ بھیڑ کو چیر کر، موٹروں، بسوں اور ٹریموں سے بچکر ان کے مطب تک پیدل جانا، قدرے انتظار کرنا، پھر اسی طرح واپس آنا، یہ مشغلہ بھی دو گھنٹہ سے کم کا نہیں- پھر ورزش وغیرہ الگ رہی- اس کے علاوہ جب گھر سے نکل کر سات آٹھ میل کے فاصلہ پر انکو

ملنے کے لئے جایا جائے تو یہ بھی مشکل ہے کہ فوراً ہی واپس آیا جائے کسی نہ کسی اور سے بھی ملنا ہو ہی جاتا ہے۔ یا سینما یا تھیئٹر میں دل بہلایا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ گھر سے نکلنے کے بعد پانچ چھ گھنٹہ سے کم میں واپسی نہیں ہوتی۔ پھر بالعموم خط لکھنے کے لئے جمعرات ہی کو، جس دن ہفتہ کی ڈاک ہندوستان جاتی ہے بیٹھا جاتا ہے اور اکثر ناممکن ہوتا ہے کہ اُسدن بھی کسی سے نہ ملا جائے یا کہیں جانا نہ پڑے۔ چند گھنٹوں میں بیوی کو، بچوں کو، بھائیوں کو، دامادوں کو، مہاراجہ صاحب الور کو، آپ حضرات کو، مولینا عرفانیؔ کو اور دوسرے دوست احباب اور اعزہ کو "بہت دلچسپ اور بہت طویل خطوں پر اصرار، اور وہ بھی ہر ہفتہ کم از کم ایک خط" کس طرح لکھا جائے؟

صاحبو! میں "ہمدرد" کی اڈیٹری ہی سے تنگ تھا۔ اگاڑی پچھاڑی تڑا کر یہاں بھاگ آیا، مگر اب یہ "بہت دلچسپ اور بہت طویل خطوں پر اصرار اور وہ بھی ہر ہفتہ کم از کم ایک خط" پر اصرار تو مجھے یہاں سے بھی مفرور رہونے پر مجبور کریگا۔ اور اھون البلیتین[1] کے طور پر "ہمدرد" کی اڈیٹری مجھ سے پھر کروا کر چھوڑے گا۔ جن نوجوان عقیدتمند دوست نے جعفری سے میرا پتہ پوچھکر اپنے محبت نامہ میں اس طرح اصرار فرمایا ہے، اور آپ لوگوں پر رشک کا اقبال جرم بھی کیا ہے، وہ "ہمدرد" پڑھتے ہی نہیں، بلکہ اس کے لئے کچھ کچھ لکھا بھی کرتے ہیں، اس لئے اگر آپ نے اس خط میں بھی "قارئین ہمدرد" کو شریک کر لیا۔ تو یہ معذرت ان کی نظر سے بھی گذرے گی، اور امید ہے کہ وہ مجھے معاف فرمادیں گے۔ لطف یہ ہے کہ وہ محض ان خوش گپیوں ہی پر کفایت کرنا نہیں چاہتے جن سے اس قسم کے "بہت دلچسپ اور بہت طویل" خط بھرے ہوتے ہیں بلکہ چاہتے ہیں کہ مختلف موضوعات پر لکچروں کا ایک سلسلہ تیار کرکے بھیجا جائے، جس میں

---

[1] دو مصیبتوں میں سے کمتر

پہلا موضوع فن صحافت ہو۔ میں اپنے جانشین، موجودہ اڈیٹر "ہمدرد" کی طرح بار بار "ہمدرد" میں شکایت کر چکا ہوں کہ جو مسلمان حضرات (اور یہی حال ہندو حضرات کا بھی ہے) "ہمدرد" کی پالیسی کی اس وقت شکایت کیا کرتے ہیں جب خود ان سے اس کی اشاعت کی کمی کی شکایت کیجاتی ہے وہ حقیقتاً "ہمدرد" کو پڑھے بغیر ہی اس کی پالیسی پر ناک بھوں چڑھایا کرتے ہیں جس طرح ہندو حضرات اسے متعصب ملی پرچہ کہتے ہیں اسی طرح مسلمان حضرات اسے ہندو پرست پرچہ کہتے ہیں اور

ع :- از مذہب من گبر و مسلمان گلہ دارد

لیکن یہ سب اسی وجہ سے کہ نہ ہندو اسے پڑھتے ہیں اور نہ مسلمان، اگر دونو پڑھیں اور تعصب کی عینک اتار کر پڑھیں تو اُسے ایک حق پرست، ملک دوست، ملت پرور پرچہ کہیں گے۔ اس طرح بے پڑھے اس کی شکایت کرنے کے لئے میں نے ایک لقب تجویز کیا تھا، جو "ہمدرد" کے ایک مقالہ افتتاحیہ کی سُرخی تھا، اور وہ ایمان "بالغیب" کے جواب میں "کفر بالغیب" ہے! افسوس، اپنے ان نوجوان دوست کے متعلق کیا کہوں جو "ہمدرد" کے اڈیٹر سے باصرار کہتے ہیں کہ "ہر ہفتہ کم از کم ایک خط" اور بہت دلچسپ اور بہت طویل خط لکھا کرو۔ اور فرمائش کرتے ہیں کہ "فن صحافت" پر ایک لکچر سے اس سلسلہ کی ابتدا کرو۔ ارے بھائی "ہمدرد" کے کم از کم بیس مقالات افتتاحی اسی موضوع پر لکچر تھے، مگر بظاہر دوستوں نے انہیں پڑھا نہیں، ان پر توجہ نہیں کی، اور دشمنوں نے جلد سے جلد بلا غسل و کفن و نماز جنازہ انہیں سپرد خاک کر دیا۔ اب پھر بعث بعد الموت پر کیوں اصرار ہے؟ ان عظام رمیم کا خیال ہی ترک کرو۔ تعلق حبل ید کی طرف متوجہ ہو۔ "شیطان" نکالو "حول" نکالو۔ میرے دفتر پارینہ کو پڑھنا " داغہائے سینہ کو تازہ رکھنا ہے۔ یہ کونسی ڈاکٹری اور کونسی جراحی ہے؟

خیر اب ۱۱ جون کی داستان سنئے۔ غالباً میں نے یہاں تک تو ما لٹا والے خط میں عرض کر دیا تھا کہ ہم سویز کی بندرگاہ پر اترے تو ڈاکٹر احمد فواد بے اور ان کے ایک دوست دو موٹریں لئے موجود تھے۔ ڈاکٹر عبد الحمید سعید بے کی زبردست اور بڑی موٹر میں تو میں نے مس رام، مسٹر دیدا اور مسٹر قاسم علی منجی کو (جنہیں ہم ڈاکٹر مونجے کہتے تھے) روانہ کیا، اور خود میں اور ڈاکٹر احمد فواد بے اور ان کے دوست ڈاکٹر فواد کی بند موٹر میں روانہ ہوئے۔ راستہ ۹۰ میل سے زیادہ ہی ہو گا، اور عجیب بات ہے کہ سویز سے لیکر قاہرہ تک سوائے ریتیلے میدان کے سارے راستہ میں کچھ نہیں۔ ایک بستی نظر نہیں آئی۔ سوائے ان چند چوکیوں کے جو راستے میں پانچ جگہ بنا دی گئی ہیں۔ نہ کہیں انسان نظر آتا ہے۔ نہ حیوانات، نہ نباتات۔ ان چوکیوں میں البتہ ایک آدھ پیڑ اگتا نظر آیا اور ایک آدھ آدمی دکھائی دیا۔ میں نے اپنے دو مصری احباب کو صرف اسی لئے سویز بلایا تھا کہ راستہ کے تین ساڑھے تین گھنٹے ضائع نہ جائیں، اپنا دردِ دل اُن کو سُنا دوں، انکی داستانِ غم ان سے سُن لوں۔ مگر راستہ کی ویرانی نے تو مدینہ منورہ کا سفر یاد دلایا۔

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

سنہ ۱۹۲۰ء میں ڈاکٹر عبد الحمید سعید بے وغیرہ سے روم میں رخصت ہوا تھا۔ اس کے بعد کے تمام واقعات احمد فواد بے کو سُنا دئے تاکہ مصری احباب ہندوستان اور اس کے مسلمانوں کے حالات سے پوری طرح واقف ہو جائیں۔ اپنے یورپ بھیجے جانے کا بھی حال سُنا دیا، جسے سُنکر ڈاکٹر احمد فواد مہاراجہ صاحب الور کی فیاضی پر عش عش کرنے لگے۔ مصر کے بھی تمام حالات سنئے۔ میں نے ان دونوں حضرات کو جو تار دیا تھا۔ اس میں لکھدیا تھا کہ میرے آنے کی اطلاع

میرے آکسفورڈ کے رفیق محمد پاشا محمود کو بھی کر دینا۔ وہ سعد پاشا زاغلول کے ساتھ جبرالٹر ہی میں اس وقت روک لئے گئے تھے جبکہ وفد ملنر کمیشن کی (جو مصر کا سائمن کمیشن تھا) ناکامی ونامرادی کے بعد یورپ جارہا تھا، اور جس طرح میں اسوقت چھنڈواڑہ میں نظربند تھا۔ وہ جبل الطارق میں نظربند کر دیئے گئے تھے۔ پھر جب ۱۹۲۱ء میں نظربندی کے بعد وفد خلافت کو لیکر یورپ گیا تھا وہ سعد پاشا زاغلول اور ان کے شرکاء کے ساتھ یورپ کو گئے تھے، بالخصوص اُن کو سعد پاشا نے گفت وشنید کے لئے انگلستان بھی جانے دیا تھا کیونکہ وہ انگریزی جانتے تھے، انگریزوں میں مدتوں رہے تھے، اور مقبول بھی تھے۔ سعد پاشا زاغلول کے متعلق عام طور پر ہندوستان میں یہ غلط فہمی ہے کہ وہ تلک مہاراج کی طرح انگریزوں سے بددل اور ان کی مصر میں مداخلت سے ہمیشہ سے بیزار تھے۔ لیکن حقیقتاً وہ مصر کے رِدیش چندر دت یا سری کرشن گپتا سے زیادہ نہ تھے۔ لارڈ کرامر کے زمانہ میں محکمہ تعلیمات کے وزیر رہ چکے تھے وہ بڑے معتدل (ماڈریٹ) تھے، ہرگز انتہا پسند (اکسٹریمسٹ) نہ تھے۔ البتہ بڑے عمدہ مقرر ہونے کی وجہ سے انہوں نے وفد کے سرکردہ ہو کر وہ مقبولیت حاصل کرلی تھی کہ جس نے بیچاری "حزب الوطن" (اکسٹریمسٹ نیشلسٹ پارٹی) کی اس ہردلعزیزی کو مٹا دیا تھا، حالانکہ وہی پارٹی مصر میں تلک مہاراج کی انقلابی پارٹی کا جواب تھی اور مرحوم مصطفےٰ کامل پاشا اور اُن کے جانشین مرحوم فرید بے لوکمانیہ تلک کا مصر میں جواب تھے چونکہ محمد پاشا محمود انگریزوں میں سعد پاشا زاغلول سے بھی زیادہ مقبول تھے اور جب کانپور کے قضیہ کے بعد میں ۱۹۱۳ء میں ولایت آیا تھا۔ تو وہ پورٹ سعید کے گورنر تھے اور جہاں تک میرا خیال ہے لارڈ کچنر سے اُن کے تعلقات بھی بہت اچھے تھے، اور وفد کی شرکت میں جبرالٹر میں نظربند

ہونے کے بعد غالباً ۱۹۲۲ء میں جبکہ مصر کی نام نہاد "آزادی" کے خلاف سعد پاشا
زاغلول نے شورش کی تھی وہ وفد کی پارٹی سے الگ ہو گئے تھے۔ اس لئے میرا
خیال تھا کہ موجودہ مشترکہ اتحادی حکومت میں جس میں وفد کی پارٹی اور اُن کی پارٹی
نے اتحاد GOALITION کر لی تھی، وہ "گرم" نہ ہونگے، بلکہ "نرم" ہونگے، لیکن مجھے
ڈاکٹر احمد فواد بے سے یہ معلوم کر کے بیحد خوشی ہوئی کہ وفد والوں سے کچھ زیادہ اُنکی
"گرمی" رہی، "حزب الوطن" کو آجکل ان پر اعتماد ہے۔ وفد والوں پر سعد پاشا زاغلول
ہی کے زمانے میں "حزب الوطن" کو (جسے اب نو چینجر NO CHANGER کہیے) زیادہ
اعتماد نہ تھا، اور اب تو مصطفٰے پاشا النحاس کی قبطی سرپرستی اور زیادہ تر محض زبانی
جمع خرچ نے اس رہے سہے اعتماد کا بھی خاتمہ کر دیا تھا۔

قاہرہ سے چلتے وقت میں نے اسٹیشن پر سے چند عربی اخبارات خرید لئے
تھے انہیں پڑھا تو معلوم ہوا کہ بہت سے مصری مصطفٰے پاشا وزیر اعظم (سابق)
پر اعتراض کر رہے ہیں کہ کیوں لارڈ جارج لائڈ صاحب سے روز روز جا کر ملاقاتیں
کیا کرتے ہیں اور قبطیوں کے سردار ولیم مکرم صاحب پر کیوں اس طرح لٹو ہیں
کہ وہ جو چاہتے ہیں اُن سے کرا لیتے ہیں۔ مجھے یہ معلوم کر کے حیرت ہوئی کہ محکمہ مال میں
سینکڑوں عہدہ داروں میں سوائے چند کے باقی سب قبطی یعنی عیسائی ہیں۔ ہمارے
ہندو بھائی، جو کسی مسلمان کے تقرر پر اس طرح ناک بھوں چڑھایا کرتے ہیں۔ مصر آ
کر دیکھیں تو انہیں معلوم ہو کہ مسلمانوں کی اکثریت نے جو مصر میں اس قدر ہے
جس قدر صوبہ سرحدی میں ہے، عیسائی اقلیت کے ساتھ کتنی رعایت کی ہے میں
نے حقیقی حالات دریافت کئے تو معلوم ہوا کہ قبطی عیسائی یوں تو مصری مسلمانوں
کے ساتھ قوم پروری اور ملک دوستی اور حریت طلبی کا بڑے زور شور سے دعوے
کیا کرتے ہیں، مگر درحقیقت وہ انگریزوں سے بھی ملے ہوتے ہیں اور دونوں

طرف سے خوب اپنا اُلّو سیدھا کرتے رہتے ہیں۔ اگر یہ حالات مجھے معلوم نہ ہوتے
تو میں اپنے دوست محمد پاشا محمود کے متعلق بدگمانی سے کام لیتا۔ وہ پہلے مواصلات
COMMUNICATIONS کے وزیر تھے اور اب وزیر مال تھے اور انہوں نے
استعفا پیش کر کے وفد والوں کی حکومت کا خاتمہ کرا دیا۔ اگر میں چند گھنٹے کے
لئے قاہرہ ۹ جون کو نہ گیا ہوتا تو ڈر تھا کہ یہ سمجھتا کہ محمد پاشا محمود لارڈ جارج لائڈ
سے مل گئے اور سعد پاشا زاغلول کی پارٹی کو حکومت سے خارج کرا دیا۔ مگر حزب الوطن
بھی اس معاملہ میں مصطفیٰ پاشا النحاس کے خلاف ہے اور ان کی وزارت کا اخراج مصر
کے حقیقی وطن پروروں کی مرضی کیخلاف نہیں ہوا۔ میں قاھرہ میں محمود پاشا محمود بملنی
کے مکان پر کارڈ چھوڑ آیا تھا۔ لیکن جب اس کے بعد ڈاکٹر عبدالحمید سعید بے حزب الو
کے گھر کھانا کھانے کے لئے واپس آیا تو ہمارے آکسفورڈ کے دوست "محمود" مجھ
سے ملنے آئے ہوئے تھے۔ افسوس ہے کہ اُن کی ایک عزیزہ کا اسی دن انتقال
ہو گیا تھا۔ اس لئے شرکت نماز جنازہ و تجہیز و تکفین کے لئے مجھ سے معذرت کر کے
چلے گئے، کھانے میں، جس پر وہ بھی مدعو تھے، شریک نہ ہو سکے۔ مجھے خوشی ہے
کہ ان کے متعلق مصر کے قوم پروروں کے خیالات بہت اچھے ہیں۔ جنگ کے
دوران میں وہ ضرور ترکوں کے طرفدار نہ تھے، لیکن وہ مصر کو انگریزوں کی غلامی
میں رکھنے کے بھی قائل نہیں ہیں اور کبھی خودغرضی کے باعث انگریزوں کی خوشامد
نہیں کرتے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ انگریزی استعمار کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ
بھی کر سکیں گے یا نہیں۔ بظاہر اُنکے پاس اس مقابلے کے لئے کوئی آلات نہیں۔
میرا خیال ہے کہ مصر کی حالت بھی ہندوستان ہی کی طرح ہے لفاظی بہت زیادہ
ہے اور عمل کم اور خودغرضیاں تن آسانیاں بھی ہیں جو لوگ خودغرض نہیں ہیں وہ
بھی تن آسانیاں پسند کرتے ہیں دونوں جگہ حسرت کے اس شعر کو ذہن نشین کرانے

کی ضرورت ہے۔

وصل کی بنتی ہیں ان باتوں سے تدبیریں کہیں
آرزوؤں سے پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں

سعد پاشا زاغلول کی لفاظی اور عمل میں "اعتدال پسندی" نے اسی طرح مصر والوں کو حزب الوطن سے توڑ لیا جس طرح ہمارے سوراجیوں کی لفاظی نے ہندوستانیوں کو نوچینج (no change) اور نان کوآپرشین پارٹی کی طرف کھینچ لیا تھا۔ لیکن جس طرح اب سرینواس آئنگر جیسے ایماندار سوراجی اس کے قائل ہوتے جاتے ہیں کہ ان کی کونسل بازی بیکار بلکہ مضر شئے ہے اسی طرح مصر کے لوگ بھی اب وفد والوں کی لفاظی سے مایوس ہو رہے ہیں اور غالباً جلد حزب الوطن کی طرف پھر رُخ کریں لیکن ہر ایک ہمت والے جوش والے اور کام کرنے والے قائد کی ضرورت ہے۔ میں حافظ بے رمضان سے جو حزب الوطن کے چار پانچ ارکان پارلیمنٹ کے صدر ہیں ملا، نہایت خوش رو شخص ہیں اور خوش گو بھی معلوم ہوتے ہیں مگر مصطفےٰ کامل پاشا کی سی بات نہیں، حالانکہ ضرورت اسی کی ہے۔ عمر کوئی ۳۵ یا ۴۰ سال کی ہوگی۔ ڈاکٹر عبد الحمید سعید بے جو غالباً اس پارٹی کے نائب صدر ہیں وہ نہایت قوی الجثہ اور بلند قامت ہیں اور انہیں میں مصری شوکت، کہا کرتا ہوں وہ نہایت پُر جوش ہیں اور صاحب ثروت بھی ہیں۔ اور مجھے روم (ROME) ہی میں یہ سُنکر تعجب ہوا تھا کہ ان کو قانون پر ایک تحقیقاتی مقالہ (THESIS) لکھنے میں پیرس کی یونیورسٹی نے ڈاکٹر کی ڈگری دی تھی۔ نہایت پُر جوش مقرر ہیں۔ جنگ کے زمانہ میں جب جمال پاشا کی فوج مصر پر حملہ کرنے کے بہانہ سے اس طرف بڑھی تھی کہ سر آئن ہملٹن (SIR ION HAMILTON) کی فوج گیلی پولی یا بوغاز پر فوراً اس وقت حملہ نہ کردے

جبکہ ترک مدافعت کے لئے تیار نہ تھے، تو ڈاکٹر عبدالحمید سعید بے ترکی فوج اور عرب رعایا کے درمیان واسطہ کے افسر (Liason Officer) تھے تاکہ سیاسی مقامی حالات سے فوج کو واقف اور آگاہ رکھیں مجھے یہ سنکر افسوس ہوا کہ حزب الوطن کے ایک پرانے روح رواں سے اُن سے حال میں کسی قدر رنا چاقی ہوگئی ہے مگر میں اس کا زیادہ ذکر نہیں کرنا اس لئے امید ہے کہ یہ جلد دور ہو جائے گی الحمدللہ کہ یہ اور ان کے ساتھی باوجود اس کے کہ ان کی پارٹی کا نام حزب الوطن ہے وطنیت کی بت پرستی میں گرفتار نہیں۔ شاید آپ نے سنا ہو میں نے عربی میں بھی (EPI- GRAMMAS) بنانا شروع کر دئے ہیں چنانچہ دو سال ہوئے ہیں نے حجاز میں ارباب مؤتمر کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ "الوطنیت ھی الوثنیت" (وطنیت ۔ وثنیت یعنی بت پرستی ہے) جب ڈاکٹر عبدالحمید سعید بے سے روم میں ملا تھا تو اس شوکت مصر کے ہاتھ میں ایک ڈنڈا بھی رہا کرتا تھا جس کی موٹھ سونے کی تھی جس پر اہرام مصر کی تصویر اور یہ الفاظ کندہ تھے المصر للمصریین (مصر، مصر والوں کے لئے ہے) میں اس زمانہ میں بھی اس پر اعتراض کیا کرتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ اس پر کرہ ارض کی تصویر ہونی چاہیئے اور یہ الفاظ کندہ ہونے چاہئیں "المخلوقات للخالق" یا دوسرے الفاظ میں العالم للاسلام"۔ الحمدللہ کہ ڈاکٹر صاحب نے جمعیت شبان المسلمین" عیسائیوں کے Y. M. C. A. کے جواب پر قائم کی ہے اس کے نوجوان ارکان کو وطن پرور اور حریت پسندی کے ساتھ ساتھ اسلام یا باصطلاح یورپ (PAN ISLAMISM) کا بھی سبق سکھایا جاتا ہے اور اٹیشن جاتے جاتے واپسی پر میں جمعیت شبان المسلمین کی دعوت پر ان کے نئے صدر مقام کی زیارت بھی کر آیا ہوں۔ وہاں جمناسٹک ٹینس اور بلیرڈ اور موسیقی کے علاوہ نماز با جماعت کا بھی

لہ ظرافت آمیز جملے۔

انتظام ہے اور وضو کرنے کی تمام سہولتیں ہیں۔
مجھے رخصت کرنے پر ڈاکٹر عبدالحمید سعید بے نے ایک زبردست تقریر میں کہا کہ مسلمانان ہندوستان کے لیڈروں کو اسلامی ممالک میں بھی جانا چاہیئے صرف یورپ کی سیر اُن کے ہلیئے کافی نہیں جن کے جواب میں میں نے اسی وقت عرض کر دیا کہ باوجودیکہ ہندوستان اس قدر مفلس اور مصر نسبتاً اس قدر متمول ہے۔ ہم لوگ اسلامی ممالک میں جاتے رہتے ہیں اور وہاں کے حالات سے باخبر ہیں۔ لیکن مصر کے قائدین ہندوستان نہیں آتے نہ ہمارے حالات سے باخبر، نہ ہماری اس قدر مدد کرتے ہیں۔ ہم یہ بھی نہیں کرتے کہ خود آتے ہیں بلکہ اپنے تجربہ کار گورنروں کو آپ کی خدمت کے لئے بھیجا کرتے ہیں، چنانچہ ہمارے مجلس کے افسر اعلیٰ لارڈ جارج لائڈ اب آپ کے مجلس کے افسر اعلےٰ ہیں حقیقت یہ ہے کہ ابھی اور ممالک اسلامی کسی قدر سو رہے ہیں اور اسلام کو صحیح معنوں میں سمجھتے ہیں ان کا عالم بیداری شروع نہیں ہوا۔ یہ اس لئے نہیں کہ وہ ہم سے کم سمجھدار ہیں بلکہ ان کو خدا کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے کہ ان کی بیداری دیر میں ہوگی۔ اس لئے کہ وہ خواب غفلت میں بھی بہت دیر میں گرفتار ہوئے، بچے صبح ہوتے ہی بیدار ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ ان کے بزرگ دیر میں سو کر اٹھتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ بچوں کو سُلا بھی جلدی دیا جاتا ہے۔ ہم ہندوستان والے بدبختی سے سب سے اول سوئے تھے۔ حکومت سب سے پہلے ہم نے کھوئی ہے اس لئے ہم مصریوں اور ترکوں اور ایرانیوں اور شامیوں وغیرہ سے پہلے بیدار ہو گئے آپ کی حکومت کو گئے ہوئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا ہے اور الحمدللہ ترکوں اور ایرانیوں کی حکومت جاتے جاتے بچ گئی یورپ کی وطنیت کا فیشن اب وہاں چل چلاؤ پر ہے لیکن اسلامی ممالک اب جاکر اس کو اختیار کر رہے ہیں۔ کچھ عرصہ بعد وہ بھی اس بت پرستی سے باز آجائیں گے اور اس خدا پرستی کی طرف

پھر آئینگے جس کا نام اسلام یا پین اسلامزم ہے۔ میں نے اقبال کی فارسی کی نظم جو طارق پر انہوں نے کہی تھی ترجمہ کرکے سنائی اور ان سے بھی اس لازوال اصول کی داد تحسین حاصل کی۔

؎:۔ ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست

اسی سلسلہ میں اشارۃً اور کنایۃً میں نے طٰہٰ حسین[1] کے فیض الحاد اور عبدالرازق[2] کے فیضِ "تفریق بین السیاست والدین" کی خوب ہنسی اڑائی اور عرض کیا کہ ہمارے بعض ترکی۔ شامی۔ مصری بھائی کہتے ہیں کہ آج متمدن دنیا کے رہنے والے اس طرز معاشرت پر لکیر کے فقیر کی طرح کیسے جمے رہ سکتے ہیں جو آج سے تیرہ سو برس پہلے ایک بدوی عرب نے عرب کے ریگستان میں اختیار کیا تھا۔ لیکن ان حضرات سے کوئی پوچھے کہ آج آپ کا اس سورج کی روشنی ہی پر کیوں انحصار ہے جو ۱۳ ہزار برس سے بھی زیادہ پرانی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح وہ قوانین قدرت جن کو ہم نظامِ شمسی میں صدیوں سے رائج دیکھتے ہیں، آج بھی نافذ دیکھتے ہیں اسی طرح اخلاقی قوانین بھی ہمیشہ سے نافذ ہیں۔ اور آج بھی انہیں رائج ہونا چاہیئے اور انہیں کا نام نظام اسلام ہے اسلام کسے کہتے ہیں یہ تیرہ سو برس سے نافذ نہیں ہے بلکہ ہمیشہ سے نافذ ہے اور ہمیشہ نافذ رہیگا۔ "فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا لا تبدیل لخلق اللہ" اس سارے

---

[1] مصر کا مشہور اندھا ادیب ڈاکٹر طٰہٰ حسین، آپ جامعہ مصر کے کلیہ آداب کے پرنسپل ہیں اور اپنی آزاد خیالی کی وجہ سے بہت بدنام ہیں۔

[2] شیخ عبدالرازق محکمۂ اوقاف کے وزیر تھے، اسلام کے نظام سیاست پر ایک کتاب لکھنے کے جرم میں معتوب ہوئے، وزارت سے برطرف کردئے گئے اور ازہر کی ڈگری چھین لی گئی۔ آپ سیاست اور مذہب میں تفریق کے بڑے داعی تھے۔

مجمع میں کیا دو شخصوں کی بھی شکل ایک ہی سی ہے اور اسی مجمع پر کیا منحصر ہے۔ کیا سارے عالم میں دو شخص یکساں صورت کے ہیں لیکن بد صورت سے بد صورت انسان کو بھی انسان سمجھا جاتا ہے کوئی اُس پر جانور ہونے کا شبہ نہیں کرتا مختلف اقطاع عالم کے انسانوں کی صورتیں بھی مختلف ہوتی ہیں لیکن مراقشی ہو یا چینی، قطب شمالی کے قریب کا رہنے والا ہو یا قطب جنوبی کا کسی کی شکل ایسی نہیں کہ ہم اس کو جنس انسان سے خارج سمجھیں خیالات اور افکار کا بھی یہی حال ہے، لیکن یکسانیت بھی یکساں ہے۔ اور جس طرح فرق مکانی کے باوجود یکسانیت ہے اسی طرح فرق زمانی کے باوجود بھی صورتوں اور افکار میں یکسانیت ہے۔ لا تبدیل لخلق اللہ پھر اس تمام مخلوقات کے خالق سے زیادہ صحیح ہدایات ہمارے طرز معاشرت کے لئے ہمیں کون دے سکتا ہے۔ انہیں ہدایات کا نام اسلام ہے اور قرآن کریم ہی تمام افکار عالم اور تمام زمانہ کے انسانوں کے لئے نظام نامہ ہے اور رسول اکرم ہی کی زندگی ہر مکان اور ہر زمان کے لئے اسوہ حسنہ ہے۔ اس استدلال سے تمام جمعیت شبان المسلمین بےحد محظوظ ہوئی۔ اور انہوں نے بڑے زور سے تالیاں بجائیں۔

خیر یہ تو رخصت کے وقت کے حالات ہیں میں نے آمد کا ذکر ابھی شروع بھی نہیں کیا ہے چنانچہ اب اس پر آتا ہوں ہماری موٹر سڑک کے ایک پتھر سے چوٹ کھا کر کچھ بگڑ سی گئی۔ اور اُس کی اصلاح میں تقریباً ایک گھنٹہ لگ گیا۔ بیٹری ٹوٹ گئی اور اگر پیچھے سے ٹامس کک کی دو موٹریں نہ آئی ہوتیں تو مشکل ہو جاتی ان میں ایک کے پاس سے بالآخر ایک بیٹری حاصل کی اور پونے گیارہ بجے عبدالحمید سعید بے کے گھر آکر اُترے سب سے پہلے برطانوی استعمار کا نظارہ کیا یعنی افواج برائے قبضہ (OCCUPATION ARMY) کا ہوائی اسٹیشن AERODROME جہاں ہیلیو پولس (HELIOPOLIS) کے قریب برطانوی ہوائی جہاز نظر آیا

اور دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ مصر کو اب تک ایک ہوائی جہاز بھی میسر نہیں آیا۔ مگر برطانوی طیاروں کا مرکز موجود ہے۔ ہیلوپولس (HELIOPOLIS) کو قاہرہ کی نئی دہلی سمجھئے مگر نہایت ہی خوبصورت ہے اس لئے کہ تعمیر مرافشی ہے ایک ہندو مندر بھی نظر آیا مگر دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ ایک فرانسیسی کا سکونتی مکان ہے۔ شاہی محل کے قریب فوجی بارکیں بھی دیکھیں اور معلوم ہوا کہ ہر مصری رجمنٹ کے ساتھ ایک برطانوی رجمنٹ بھی قیام فرما ہے۔ عبدالحمید سعید بک کے مکان پر پہنچتے ہی قاضی ابوالعزائم[1] کی طرف سے ایک وفد استقبال کے لئے آیا ان کا نوازشنامہ بھی ملا اور تار بھی۔ اس وفد میں ان کے صاحبزادے اور ہمارے مکہ معظمہ کے سب سے پہلے ترجمان بھی تھے جو یہاں وکیل ہیں۔ انکے بعد مؤتمر کے آخری اجلاسوں کے قائم مقام سیکرٹری جنہوں نے توفیق شریف کی کاہلی اور سازش نوازی کے لازمی نتیجے سے بچا کر مؤتمر کی روداد کا ایک مکمل خلاصہ آخری جلسہ ختم ہوتے وقت ہمیں سنایا تھا اور جو سعود ابن عبدالعزیز ولیعہد نجدی کے جہاز میں مصر جاتے وقت ہمیں ینبوع میں ملے تھے۔ یہ علی حسن الاخبار[2] کی طرف سے انٹرویو لینے آئے۔ اخبار "السیاسۃ" میں کراچی کے محمد خاں کا تار چھپا تھا جس میں بتایا گیا تھا کہ ابن سعود کے قتل کے لئے شوکت صاحب امام یحییٰ کے ساتھ سازش کر رہے ہیں اور اس کے متعلق ایک شخص کے پاس سے ابن سعود کو خطوط ملے ہیں جن میں شوکت صاحب کا بھی ایک خط ہے۔ "ہمدرد" اور "خلافت" میں اس "سازش کے انکشاف" کی اچھی طرح دھجیاں اڑا دی گئی ہیں اور میں جانتا تھا

---

[1] مصر کے ایک صاحب طریقت بزرگ تھے۔ خلافت اسلامیہ کے احیاء کے بڑے متمنی تھے۔ ہندوستان کے حالات سے بڑی دلچسپی تھی۔

[2] ایک شامی نوجوان تھے۔ ہندوستان بھی آئے تھے۔ سلطان ابن سعود کے حامیوں میں سے تھے، بعد میں ان سے بھی اختلاف ہو گیا،

کہ آپ لوگ اس کام کو اچھی طرح انجام دینگے۔ لیکن میں خوش ہوا کہ اس "سازش" اور اس کے "انکشاف" نے مجھے ابن سعود کی ملکیت اور اس کے مرکز اسلام میں مذہبی جبر و اکراہ کے خلاف اپنے خیالات ظاہر کرنے کا اچھا موقعہ مِل گیا اور میں نے ایک مربوط مدلل اور مبسوط بیان میں ان خیالات کا اچھی طرح اظہار کر دیا جس سے آپ لوگ اور قارئین "ہمدرد" اچھی طرح واقف ہیں۔ نہ معلوم علی حسن صاحب نے "الاخبار" کی کچھ کاپیاں آپ کو اور "خلافت" کو بھیجیں یا نہیں، میں ان سے کہہ آیا تھا کہ ایک درجن کاپیاں میرے نام ٹامس کک کے پتے سے لندن بھیج دیجئے گا مگر افسوس یا تو انہوں نے بھیجی نہیں یا وہ پہنچی نہیں۔ صرف ایک کاپی ایک ہندوستانی بھائی کی بھیجی ہوئی جن کی کنیت ابو النصر ہے مجھے ٹامس کک کی معرفت ملی اور میں نے ملتے ہی اسکے ابتدائی حصہ پر ایک سرسری نظر ڈال لی مگر افسوس کہ اس کے دوبارہ مطالعہ سے پہلے ہی ضائع ہوگئی اور یہ میری سستی کا نتیجہ ہے کہ اب تک میں نے مصر سے اور کوئی کاپی نہیں منگائی۔ انشاء اللہ آج مصر لکھوں گا کہ اس پرچہ کی چند کاپیاں مجھے اور آپ کو ارسال کر دی جائیں۔ اور "الاخبار" کے لئے "خلافت" اور "ہمدرد" اگر جاری نہیں ہیں تو جاری کر دئے جائیں۔

اس تمام ملاقات میں ڈاکٹر احمد فواد بے میرے ترجمان تھے۔ میرا خیال ہے کہ یہ عجاج[2] سے بھی بہتر ترجمان ہونگے۔

جامعہ ازھر کی زیارت کی سینکڑوں طلباء مسجد میں کھڑے بیٹھے اور لیٹے ہوئے

---

[1] بھوپال کے ایک طالب علم جو کافی عرصہ سے مصر میں مقیم ہیں۔ موصوف عربی زبان میں بڑا ملکہ رکھتے ہیں اور اکثر مصری اخبارات اور رسائل میں مضامین لکھتے رہتے ہیں۔

[2] فلسطین کے ایک نوجوان ادیب انگریزی زبان پر بڑا عبور ہے عربی کے مشہور انشاپرداز ہیں آپ نے امریکی مصنف کی جدید بڑ نیلے اسلام کا عربی میں ترجمہ کیا اور عربی سے اردو میں ترجمہ ہوا ہے۔

تھے، کچھ کھانا کھا رہے تھے۔ کچھ کتابوں کا مطالعہ کر رہے تھے کتب خانہ دیکھا، چند نادر کتابیں دیکھیں۔ چند علماء کے مزارات پر فاتحہ پڑھی اور مسجد میں داخل ہونے کا تحیۂ دو رکعات نماز پڑھی۔ طالب علم ساری دنیائے اسلام سے آئے ہوئے ہیں اور تقریباً سب کے سب غریب اور مفلس معلوم ہوتے ہیں۔ میں نے خدا سے دعا مانگی کہ اُن کو علماءِ سوٗ کے پنجے سے نکال کر اسلام کی حقیقت سے آگاہ فرما دے اور اُن کو صحابہ کرام جیسے مسلمان بنا دے تاکہ پہلے مسلمان مسلمان ہو جائیں اور پھر صحیح اسلام کے نور کا جھنڈا چار دانگ عالم میں پھیلائیں۔ ان کے بعد اتنا وقت نہ تھا کہ امام شافعی کے مزار تک جاتا اس لئے کہ وہ دور تھا۔ محمد علی پاشا کی مسجد کی سیر کی، واپسی میں محمد پاشا محمود کے گھر جا کر کارڈ چھوڑا اور پھر ڈاکٹر عبدالحمید سعید کے گھر واپس آیا، یہاں مصر کے بہت سے زعماء جن میں سیاستین شعراء جریدہ نگار مؤرخ اور چند بڑے عہدہ دار شامل تھے جمع تھے۔ سب سے ملاقات کی اور اس کے بعد کھانے کے کمرہ میں گیا، کھانا دو لمبی میزوں پر چنا ہوا تھا جو معمولی میزوں سے زیادہ اونچی اور "بوفے" (Buffet) کی میزوں کی طرح تھیں جہاں کھڑے ہو کر کھایا جاتا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی کھڑے ہو کر کھانا کھایا۔ کھانا مصری تھا جو تقریباً یورپین کہا جا سکتا ہے مگر اس کی مقدار بالکل ایشیائی تھی اسلئے کہ تیس آدمیوں کے خوب پیٹ بھر کر کھانے کے بعد کوئی ڈیڑھ سو کے لئے کافی کھانا بچا تھا۔ گوشت کے ٹکڑوں کو اس خوبصورت طریقہ سے جمع کیا گیا تھا کہ بالکل ایک باشتبہ اونٹ معلوم ہوتا تھا۔ عمر بھر میں شاید ڈٹ کر میں نے کبھی کھانا کھایا ہوگا اور میری کیفیت بالکل اُن بزرگ کی سی تھی جو کسی دعوت میں جاتے تھے تو پہلے تو خوب کھل کھلا کر ہنستے تھے پھر رفتہ رفتہ ہنسی بند ہو جاتی تھی اور بالکل خاموش ہو جاتے تھے اور آخر میں رو پڑتے تھے یہاں تک کہ چیخیں مارنے لگتے اور جب پوچھا جاتا تھا کہ حضرت یہ کیا ماجرا ہے تو فرمایا کرتے تھے کہ "بھائی جب اتنا لذیذ

اس لئے کہ مصنوعی طور پر تو اکثر دنیا دار دین دار بنتے ہیں اور اکثر دین دار بدترین قسم کے دنیا دار ہوتے ہیں۔

اس تقریر کے بعد بہت سی تصویریں کھینچی گئیں اور بالآخر مجھ کو فرصت ملی کہ گھنٹہ بھر کے لئے اس شخص سے بھی جا کر مل آؤں جو برسوں سے میرا محبوب ہے۔ اور جو غالباً آج دنیا کا سب سے بہتر مسلم عالم ہے چنانچہ میں ڈاکٹر احمد فواد کے ہمراہ شیخ شاویش کے مکان پر گیا۔ اور ایک گھنٹہ ان کی صحبت میں گذارا۔ اور ان کی امامت میں عصر کی نماز پڑھی اور ان کے بچوں کے ساتھ کھیلتا رہا اور برسوں کے رنج و غم اور کلفت کو دور کرتا رہا۔ شیخ شاویش انگریزی خوب بولتے تھے اور میں دل کھول کر ان سے باتیں کر سکا۔ یہی وہ شخص تھا جو ترکان اتحاد و ترقی کی روح رواں اور مصر کی حزب الوطن کا جان تھا اور جو آج مصطفےٰ کمال پاشا اور سعد پاشا زاغلول دونوں کے اسلام سے تغافل بلکہ اس کی مخالفت سے مایوس ہو کر ایک گوشہ میں اپنی زندگی کے دن گذار رہا ہے۔ لیکن یہ نہ سمجھئے کہ وہ کاہل ہے۔ وہ بھی ہماری طرح یہی اعتقاد رکھتا ہے کہ پہلا کام صحیح تعلیم کے ذریعہ سے افکار اور ذہنیتوں کی اصلاح کرنا ہے چنانچہ وہ محکمہ تعلیم میں مصر کی ابتدائی تعلیم اور ان پڑھ عمر رسیدہ لوگوں کی تعلیم کا بند و بست کر رہا ہے اور دن بدن اچھے تعلیم یافتہ بچوں اور نوجوانوں اور بوڑھوں کی تعداد بڑھا رہا ہے۔ مجھے اس سچے اور پکے مسلمان عالم کے گھر میں بہت سی تصویریں نظر آئیں اور باجہ بھی نظر آیا اور میرا جی چاہا کہ اپنے بعض علماء کو یہاں لاتا تاکہ وہ بجائے میرے اس عالم دین سے بحث کرتے کہ یہ چیزیں اسلام میں ممنوع ہیں یا نہیں۔ ایک تصویر تو بہت کچھ عریاں تھی اور شہر پیرس کی ایک رقاصہ کی تھی جو ان کے بھتیجے یا بھانجے کی کھینچی ہوئی تھی مگر یہ اس لئے نہیں کھینچی گئی تھی کہ اسے عریاں رقاصہ سے عشق تھا بلکہ حقیقتاً یورپ کی تہذیب عریاں کا مذاق

اڑانا مقصود تھا۔ افسوس کہ یورپ کی یہ تہذیب وفد والوں کی سیاست کی طرح مصر میں بھی بہت زور پکڑ چلی ہے اور مصری عورتوں کے لباس یوں کہیئے کہ بے لباسی میں نمایاں ہے جسم عریاں کے ہمرنگ جرابیں اور گھاگرہ کی طرح اونچا ساآ (SKIRT) یہاں بھی استعمال ہو رہا ہے اور جو عورتیں اب تک برقعہ پوش ہیں انکی نقاب بھی اتنی باریک ہے اور اس کے جالی کے پھندے اتنے دُور دُور ہیں کہ سارا چہرہ نظر آتا ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے۔ کہ حسن کو دوبالا کر دیتا ہے۔ اور جالی کے پھندے عشاق کو گرفتار کرنے میں اچھی طرح کام دے سکتے ہیں۔ میں ابھی اس کا قائل نہیں ہوں کہ اسلام نے چہرے کو بے نقاب کرنیکی اجازت نہیں دی مجھے حدیث شریف پر عبور نہیں لیکن قرآن کریم میں جو کچھ پردہ کے بارہ میں ہے اسے دیکھکر میرا یہ خیال ہے کہ جس طرح پرانے فیشن کی ہندو عورتیں صوبجات متحدہ میں سفید چادر اوڑھ کر اور گھونگٹ کاڑھ کر عزیز و اقارب کے یہاں جانے کے لئے سڑکوں پر سے گذرتی ہیں وہ صحیح اسلامی حجاب ہے اور اس سے زیادہ افراط و تفریط ہے لیکن بجائے اسکے کہ یورپ کا سیلاب بے حیائی ہمیں غرق کر دے بہتر ہو کہ علماء اور زعماء ایک بار خود بیٹھیں اور قرآن کریم اور حدیث شریف کو سامنے رکھیں اور اس کا فیصلہ کریں کہ اسلامی پردہ ہے کیا اور اس کو کس طرح قائم رکھا جاوے اگر یہ نہیں کیا گیا اور شرفاء کی عورتوں کو چار دیواری کے اندر محبوس رکھنے پر اصرار کیا گیا تو مجھے اندیشہ ہے کہ پردہ اور حجاب ہی رخصت نہیں ہوگا بلکہ شرم و حیا کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ ترکوں کے ارباب حکومت کی بے دینی ایک بڑی حد تک تنگی علماء کی تنگ دلی اور تنگ عملی کے خلاف ردعمل ہے ڈر ہے کہ ہمارے رسمی پردہ کی سختی کا ردعمل بے حیائی کی صورت میں نمودار نہ ہو۔

میں ڈاکٹر عبدالحمید سعید بے کے ہمراہ کنٹیننٹل ہوٹل (CONTINENTAL

گیا تھا تاکہ وہاں سے اپنا ایک بیگ جس میں کچھ کپڑے تھے اور آموں کا پارسل لے آؤں جو اُن کی موٹر میں مس رام مس ویدا ور مسٹر منجی کے ہمراہ آیا تھا اور اس ہوٹل میں غلطی سے اندر لیا گیا تھا وہاں اور لوگوں کی طرح ایک انگریز افسر کی جو نز کی ٹوپی اور ریچھے کھڑے تھے، میرے عجیب و غریب کھدر کے لباس اور ہلال احمر والی ٹوپی پر نظر پڑی۔ تو انہوں نے عبدالحمید سعید سے پوچھا کہ آپکے ساتھ کون ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہندوستان کے زعیم مولانا محمد علی ہیں جو ابھی مجھ سے ملنے تشریف لائے ہیں یہ سنکر افسر سخت متعجب ہوئے اور فرمایا کہ عجیب بات ہے، اب تک میرے محکمہ نے مجھے اُن کے آنے کی اطلاع نہیں دی۔ افسر مسٹر رسل RUSSEL نامی ایک انگریز ہیں جو یہاں کے محکمہ پولیس کے افسر اعلے ہیں۔ میں نے سُنا ہے کہ یہ آدمی بے حد شریف ہیں اور اعلے خاندان کے ہیں۔

رخصت کے وقت اسٹیشن پر بہت سے ہندوستانی جن سے اپنے میزبان کے مکان پر اور الازہر میں ملا تھا اور جن میں سے چند کے ساتھ تصویریں بھی کھچوائی گئی تھیں اور مصری احباب اور عالم الازہر شیخ زنکلونی اور شیخ شاویش وغیرہ تشریف لائے تھے، ہندوستانی طلباء نے ایک نہایت خوبصورت اور بڑا گلدستہ عطا کیا جسے میں نے اُسی وقت مس رام کو دے دیا (یہ دہلی کے زنانہ طبیہ کالج میں کیمیا پڑھاتی ہیں) رات کے ساڑھے دس بجے ہم بندرگاہ سعید پہنچے جہاز پر نواب صاحب پالن پور سے نیاز حاصل ہوا آپ ہم سے ایک ہفتہ پیشتر بمبئی سے روانہ ہوئے تھے مصر میں اتر پڑے اور آج ہی مصر سے ہمارے جہاز میں روانہ ہو رہے تھے آپ کے سیکرٹری اور آپ کے مہمان ٹھاکر صاحب لمبڈی کے صاحبزادہ میری ہی کیبن میں سفر کر رہے تھے اور نواب صاحب کے پاس وہ کمرہ تھا جسے مہاراجہ الور نے احتیاطاً چند ماہ پیشتر ہی سے اپنے لئے مخصوص CABIN (RESERVE) کرا لیا تھا کہ کہیں اسی سال ٹیبل کمیشن کے رلئے ولایت نہ جانا پڑے۔

اس کے بعد ایک بوڑھے صورت صاحب جو ہمارے ہم سفر تھے مگر جن سے آج تک کبھی علیک سلیک کی بھی تو نوبت نہیں آئی تھی یکا یک ہم کلام ہوئے فرمایا کہو قاھرہ دیکھ آئے اہرام مصر کیسے ہیں۔ میں نے کہا کہ میں اہرام مصر دیکھنے نہیں گیا تھا انہیں اس سے پیشتر دیکھ چکا ہوں۔ فرمایا کسی بزنس (کاروبار) کے لئے گئے تھے (یہ سب کچھ نہایت ظریفانہ انداز کے ساتھ) میں نے کہا کہ نہیں! میں چند احباب سے ملنے گیا تھا۔ اس پر فرمایا کہ کہو مصر کی سیاسی صورت حال کیسی ہے، ہماری تم پر ہر وقت نظر رہی ہے۔ ہمیں سب کچھ معلوم ہے کہ تم کیا کرتے ہو میں نے کہا کہ مجھے نہیں معلوم کہ مصر کی سیاسی صورت حالات کیسی ہے۔ میرا کام تو اسی قدر رہے کہ ہندوستان کی سیاسی صورت حالات جتنا ہو سکے آپ لوگوں کے لئے خراب کرتا رہوں۔ بحمد اللہ مصر میں بھی بہت سے لوگ موجود ہیں جو یہاں کی صورت حالات کو بھی آپ کے لئے خراب کر رہے ہیں اس پر بہت جھینپے۔ مگر بھلا یہ کیوں بند ہونے لگے۔ کہنے کہ تم صرف اپنے ملک کا انتظام کرتے ہو۔ ہماری سارے ملکوں پر نظر رہتی ہے۔ میں نے کہا آپ اسی قوم کے تو ہیں جس کے متعلق لارڈ سالسبری نے فرمایا تھا کہ ان کا ہمیشہ اصرار ہوتا ہے کہ فوراً چاند کو فتح کر لیا جائے اور اسکے لئے یہ دلیل پیش فرماتے ہیں کہ اگر ہم نے اسے اپنے سامراج میں ملحق نہ کر لیا تو مریخ والے اسے ملحق نہ کر لیں۔ آخر اس پر شرما کر خاموش ہو گئے اور اس کے بعد پھر مارسیلز پہنچنے تک بھی کبھی مجھ سے ہم کلام نہیں ہوئے۔

اچھا اب اس ۱۸ جولائی کے خط کو ۱۹ جولائی کے دوپہر کے روز ۱۱ بجے کو پورٹ سعید سے روانگی پر ختم کرتا ہوں اور اگلے خط میں انشاء اللہ لندن پہنچکر کوئینس کلب اور پھر ومبلڈن میں ٹینس کے ٹورنامنٹ دیکھنے کے حالات سناؤں گا۔ نیز ہنڈن جاکر فوجی طیاروں کی نمائش اور امرا کی فیلڈ میں اکسفورڈ کیمبرج کی کرکٹ میچ وغیرہ بھی یہاں کے سینماؤں اور ایک تھیٹر کی اپنی پرانی معشوقہ اور اس کے خاوند سے ملاقات

اور اُن کے گھر جا کر چائے پینے اور کھانا کھانے کے اور دیگر اشخاص سے ملاقاتوں کے اور نیز اس پُر لطف اور مشکل جستجو کے کہ نماز ظہر کلب و میلڈن اور لارڈس میں کہاں پڑھی جاوے، اور نماز عصر و مغرب سینما اور تھیٹر میں کس جگہ ادا کی جائے وغیرہ وغیرہ۔ اپنے پہلے فاقہ کے حالات بیگم صاحبہ کے خط میں لکھوں گا جو اُن سے لیکر پڑھ لیجئے گا بلکہ اس حصہ کو اور مریضوں کے لئے شائع بھی کر دیجئے گا۔

گذشتہ ہفتہ میں میری ایک تصویر لارڈس LORDS کے میدان کے دروازہ پر ایک مصور نے کھینچ کر شائع کر دی تھی۔ مگر آکسفورڈ کی جگہ لکسر[1] لکھ گیا تھا۔ (محمد علی[2] پاشا اور لکسر میں تعلق بھی قریبی ہے) محمد علی اور آکسفورڈ میں اب تو تعلق بھی بعید ہو گیا اب "آکسن" کو کون "تار بابو" "بیل والا" سمجھے گا) اس بار السٹریٹڈ ڈرامیٹک نیوز (Illustrated Dramatic News) کا ایک پرچہ ارسال کرتا ہوں (پرچہ ارسال کرنے کا اب وقت نکل گیا صرف چند اوراق اسی خط میں ملفوف کر کے بھیجتا ہوں جس میں ایک مصور نے میری تصویر و مبلڈن میں لیکر شائع کر دی تھی جامعہ ملیہ کے سابق طالب علم مقبول علی صاحب[3] نے اُسے دیکھ کر جانا کہ ان کا شفیق اور بوڑھا استاد انگلستان پہنچ گیا اور جب وہ ملے تو اس کا ذکر مجھ سے کیا۔ کل اخبار والوں نے اس کا بلاک بھی مجھے بھیج دیا۔ اجازت لیکر انشاء اللہ آئندہ آپ کو ارسال کروں گا تاکہ "ہمدرد" اور "خلافت" میں بھی نذر قارئین کرام کیا جا سکے چونکہ مفت کا مال ہے اس لئے حلال ہے۔ ورنہ مجھے اپنی تصویر شائع کرانا حرام معلوم ہوتا ہے۔ بیگم صاحبہ کے خط سے معلوم ہوا کہ آپ کو میرا عدن کا تار نہیں ملا۔ براہ کرم تار والوں سے دریافت

---

[1] مصر کا ایک شہر الظفر۔

[2] مصر کے موجودہ شاہی خاندان کا جد اعلیٰ

[3] جامعہ کے پرانے طالب علم عرصہ دراز سے انگلستان میں قیام فرما ہیں۔

کیجئے میں بھی عدن طوائی والوں سے دریافت کروں گا عجیب بات ہے کہ انہنے دام دے کر تاروں اور آپ کو نہ ملے تار کا پتہ "کمریڈ دہلی" لکھا تھا جس تپ سے اب تک تار ملتے آئے ہیں۔

آج ہی صبح کو ۱۹ سے ۳۰ جون تک کے "ہمدرد" اور "خلافت" کے پرچے ملے۔ تعجب ہے کہ سوئز سے ارسال کیا ہوا آپ کے نام کا خط کسی میں شائع نہیں ہوا۔ اس سے زیادہ تعجب یہ ہے کہ شوکت صاحب کو ابھی میرا عدن کا خط نہیں ملا اسوقت سکلات والا کی دعوت پر دار العوام میں چاء نوشی کے لئے جا رہا ہوں۔ ان کی زوجہ محترمہ نے چند مسلمان خواتین کو چاء پر وہاں بلایا ہے، ممکن ہوا تو کل جا کر پولیس کی اس تحقیقات پر مباحثہ سنونگا جو مس سیوج اور سر لیو منی کے مقدمہ کے سلسلہ میں ہوئی تھی جس طرح مس سیوج سے بیان حاصل کرنے پر پولیس پر طعن کی بوچھاڑ پڑی ہے اور سب نے اس کا اعتراف کیا کہ پولیس کسی کو مجبور نہیں کر سکتی کہ کسی سوال کا جواب دے اس کے بعد تو میرا بھی جی چاہا کہ جب ڈوور میں (Dover) مجھ سے سوالات بار بار کئے گئے کہ کیا آپ پارلیمنٹری کانفرنس میں شریک ہونگے، آپ کس لئے آئے ہیں یہاں کہاں قیام فرمائیں گے وغیرہ وغیرہ، اور محاصل بحری وصول کرنے کے بہانے میرے سامان کو ہر طرف سے الٹ پلٹ کر اور بالخصوص میرے کاغذات اور جیب (Dutiable Articles قابل محصول اشیاء) ان اشیاء کی فہرست دیکھکر جن پر محصول واجب الادا تھا میں نے عرض کیا کہ ان میں صرف SACCHARIN (مصنوعی شکر) کی پندرہ بیس چھوٹی چھوٹی گولیاں میرے پاس ہیں اور کچھ نہیں، ایک افسر نے کہا کہ وہ دکھاؤ کہاں ہیں اور دوسرے نے جھڑک کر کہا سکریٹ کو جانے بھی دو،

لہ مس صاحبہ اور اُن کے ساتھی ہائیڈ پارک میں مشتبہ حالت میں دیکھے گئے، سکاٹ لینڈ یارڈ (لندن پولیس) نے سوال جواب کے دوران میں سختی کی، اس پر پارلیمنٹ میں پولیس پر بڑی لے دے ہوئی اور ملک میں اس پر بڑا شور برپا ہوا۔

اسے کیا دیکھنا (یعنی دیکھنا دراصل DUTIABLE ARTICLES کا نہ تھا بلکہ میرے کاغذات دیکھنا تھے) میرا بے اختیار جی چاہا کہ کہدوں کہ مس سیوج اور سرلیونی کے مقدمہ کے بعد بھی مجھ سے سوالات کرنے کا آپ کو حق ہے ۔ I am more Savage
Savidge than she, but I have no money with me
Money
جب بار بار پارلیمنٹری کانفرنس کی شرکت کے متعلق سوال کیا تو میں نے کہا کہ (مجھے آپ کی پارلیمنٹ کی کانفرنس کی شرکت سے گھن آتی ہے) (ریمزے میکڈانلڈ صاحب ایک نام نہاد Common Wealth Conference منعقد فرمارہے تھے) جس سے چمن لال اور اینڈ ریوز وغیرہ بالآخران کے استبداد سے تنگ آکر چلے آئے) جب اس پر اظہار تعجب فرمایا گیا تو میں نے اتنا اور بڑھا دیا۔کہ Because I detest your Parliament (کیونکہ مجھے آپ کی پارلیمنٹ سے گھن آتی ہے) میں نے ان کے اور سوالات کے جواب میں کہا کہ آپ میرے پاسپورٹ کو دو تین بار دیکھ چکے ہیں کیا وہ کافی نہیں ہے وہ تو آپ ہی کی گورنمنٹ کا عطا فرمودہ ہے۔اس کا کچھ جواب نہ ملا۔پھر فرمایا کہ آپ کہاں رہتے ہیں کلکتہ میں تب تو میں نے عرض کیا کہ کم از کم انگلستان کی خفیہ پولیس کو اس کی تو اطلاع ہونی چاہیئے کہ علی برادران کہاں رہتے ہیں۔کہا کہ ہاں۔آپ لوگ تو ہندوستان میں بہت مشہور ہیں میں نے کہا ایک زمانے میں یہاں بھی بہت مشہور تھے چلتے وقت میں نے عرض کیا کہ آپ نے ناحق میرا اتنا وقت ضائع کیا۔اب چل کر ریل میں جگہ دلوایئے تو شرما کر فرمایا آپ کو ضرور جگہ مل جائیگی۔خدا خدا کرکے جگہ ملی اور مقررہ وقت سے کوئی آدھ گھنٹہ بلکہ پون گھنٹہ بعد ہم ڈوور سے روانہ ہوئے اچھا اب واقعی رخصت۔

خیر طلب اور آپ کا دور افتادہ دعاگو اور آپ کی دعا کا طلبگار

محمد علی

(۷)

مالٹا

لندن یکم اگست ۱۹۲۸ء

پیارے ماجد میاں ظفر الملک صاحب جعفری

میں اپنے گذشتہ خط میں جو آج سے دو ہفتہ بیشتر لکھا تھا۔ اپنی ۱۱ ر جون کی تمام کارگذاری لکھ چکا ہوں جو قاہرہ میں واقع ہوئی تھی۔ اور اس ڈاک سے مصری اخبارات "الاخبار" اور "الفتح" کے وہ پرچے بھی بھیج رہا ہوں جس میں محمد علی حسن صاحب نمائندہ "الاخبار" سے میری گفتگو شائع ہوئی ہے اور جمعیتہ شبان المسلمین میں جو تقریر میں نے کی تھی اس کی تائید میں ایک مضمون ہے۔ یہ پرچے آج سے ایک مہینہ پیشتر ہی بھیج دیئے گئے ہوتے۔ مگر غلطی سے میرے ایک پُرانے شاگرد جو یہاں میرے رفیق اور ایڈی کانگ اور اس وقت میرے کاتب بھی ہیں، بھولے سے انہیں ریاست آلور کے وزیر اعظم صاحب کے کمرہ میں ہائڈ پارک ہوٹل میں چھوڑ آئے تھے اور سارے کمرے میں تلاش ہو رہی تھی اور نہ ملنے پر تعجب تھا۔ دو دن ہوئے کہ راؤ گردھاری لعل نے فرمایا کہ تم کچھ کاغذات میرے یہاں چھوڑ گئے ہو اور معاً مجھے خیال ہُوا کہ وہی پرچے ہونگے جن کی میں اور میرے رفیق اس سرگرمی سے تلاش کر رہے تھے۔ براہِ کرم ان پرچوں کو مولانا عرفان کے نام دفتر "خلافت" میں بھی بھیج دیجئے گا۔ تاکہ وہ بھی پڑھ لیں اور اخبار "خلافت" میں بھی یہ چیزیں شائع ہو جائیں۔

آج ہی صبح ۱۳۔ جولائی ۲۸ء کو "ہمدرد" کے پرچے ملے، جس سے معلوم ہُوا کہ دمشق میں سلطان ابن سعود کے نمائندہ نے اس سازش کی پُوری تردید فرما دی، جسے کراچی والے محمد خاں صاحب نے بظاہر گھڑا تھا۔ نہ معلوم بارش میں بھی پنجاب کے پانچ

دریاؤں میں اتنا پانی ہوگا کہ مہر صاحب اس میں ڈوب مریں۔ پہلے میں نے عزمی پاشا مصری جنرل سے ابن سعود کے قتل کی سازش کی تھی۔ شاید اب آپ کے ذوالفقار بھائی کی باری آئیگی اب تو بیچاری بہن بھی نہیں رہی کہ ذوالفقار صاحب کے بعد اس کا نمبر آئے۔ لیکن کیا مُردوں میں کوئی انقلاب نہیں ہو سکتا کہ وہ بھی سازش کریں تاکہ اس بار میرے دو مرحوم بھائیوں اور ایک بہن اور والدین کا نمبر بھی آجائے۔ مزے کی بات تو یہ ہے کہ "ہمدرد" ہی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایک صاحب کو اس کی شکایت ہے کہ "ہمدرد" نے اِس بارہ میں کیوں قلم اُٹھایا۔ بالکل صحیح فرمایا۔ غالباً غالب کے اصلی دیوان میں ان کا مشہور شعر اس طرح تھا کہ ؎

لکھنے پر وہ ہاتھ کرتے ہیں قلم
وہ لکھیں اور پڑھا کرے کوئی

مجھے یہاں آئے ہوئے اب چالیس دن ہو گئے اور وقت آگیا ہے کہ کچھ یہاں کے حالات بھی آپ کو لکھ بھیجوں، لیکن ابھی میرے سفر کا ایک ٹکڑہ باقی ہے اور وہ ۴ار جون کی تاریخ ۱۱ بجے دن کے ماٹل پہنچا ہے۔ اس سے پیشتر مارسیلز سے پیرس کے ۴ ر ۵ دن کے قیام اور پیرس سے لندن تک کے سفر کے حالات گذشتہ خط میں آپ کو لکھ چکا ہوں۔ مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ میری چھوٹی بچی گلنار نہایت شوق سے اپنے بوڑھے باپ کے حالات اخبارات میں پڑھا کرتی ہے۔ اس کے پچھلے خط میں درج تھا کہ اخبارات سے معلوم ہوا کہ آپ کا سامان ڈوور میں خوب الٹ پلٹ کر دیکھا۔ لیکن چونکہ آپ کے خط میں اس کا کچھ ذکر نہ تھا اسلئے غالباً خبر غلط ہوگی۔ کل پرسوں غالباً آپ کو میرا پچھلا خط ملجائیگا اور گلنار کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ خبر صحیح تھی۔ چونکہ اس تجسس اور تفتیش کی پہلے ہی سے توقع تھی، اسلئے مجھ پر اس کا مطلق اثر نہیں ہوا تھا، اور اگر یہاں کے ایک ہندوستانی نامہ نگار نے اس کے متعلق ہندوستان کو تار نہ دیا ہوتا تو میں اس کا ذکر ہی نہ کرتا۔ گلنار[1] بھی ۱۹۱۹ء میں بہت ہی چھوٹی

---

[1] مولنا کی سب سے چھوٹی صاحبزادی

تھیں۔ ان کو اب کیا یاد رہا ہوگا کہ نو برس بیشتر رمضان المبارک میں ۸ جون ۱۹۱۹ء کی صبح کو سحری کے بعد ہمارے چھندواڑہ کے بنگلہ کا جب محاصرہ کیا جا چکا اور ہم کو گرفتار کرکے مسلح پولیس کی معیت میں موٹروں میں بیتول جیل روانہ کیا جا چکا تو کرنل بلاوڈن صاحب ڈپٹی کمشنر کے حکم اور حکومت کی منظوری سے ہمارے گھر کی تلاشی لی گئی تھی۔ لیکن باوجود سخت جستجو کے جس میں احاطہ کی زمین تک کھود دی گئی تھی، اور باورچی خانہ کی راکھ کی ہنڈیاں تک الٹ کر، باوجود غالبؔ کے پہلے ہی سے کہہ دینے کے کہ ؎

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

بہت سی راکھ کریدی گئی تھی، بے چاروں کو کچھ نہ ملا تھا، البتہ خود گلنار بیگم کی گڑیوں میں ایک خالی کارتوس مل گیا تھا، جسے وہ مالک مکان کے سکونتی مکان میں سے اٹھا کر لائی تھیں، جہاں چار عیسائی والنٹیئر جو بڑے پکے شکاری تھے، اور شیر اور ہرن مار کر لایا کرتے تھے، رہا کرتے تھے۔ اس چھوٹے ہوئے کارتوس کو ان غریبوں نے نہایت احتیاط سے محفوظ کرکے اس پر اپنی مہر ثبت فرمائی تھی۔ لیکن وہ جیبی (ہوٹیزر HOWITZER) "گن" جس کے ملنے کی امید تھی، کسی جگہ دستیاب نہ ہو سکی تھیں، حالانکہ یقین کیجئے کہ ہم پورا سامان حرب تیار کر چکے تھے، اس واقعہ کے متعلق میں نے نواب یوسف علیخاں مرحوم المتخلص بہ ناظم کا ایک شعر بیتول سے اپنے خط میں سنسر صاحب کو دکھا کر، کسی دوست کو لکھ بھیجا تھا۔ اور ڈھونڈ کی تلاش و جستجو کے بھی اس شعر کو دھراتا ہوں ؎

لی محتسب نے خانہ تلاشی تو کیا ہوا
نکلا سبوئے کہنہ میں سرکہ بھرا ہوا

خیر اب چلتے چلاتے مالٹا پہنچنے کا حال بھی سن لیجئے۔ ۱۴ جون کو ۱۱ بجے ہمارا جہاز مالٹا پہنچا تھا اور یہ پی اینڈ او کمپنی کا غالباً پہلا جہاز تھا جو جنگ کے بعد سے وہاں گیا تھا۔

ہمارے استقبال کیلئے ہر طرف سے ہوائی جہاز اُڑ اُڑ کر آ رہے تھے اور چیلوں کی طرح یا یوں کہئے کہ سی گلز SEA GULLS کی طرح، جو سمندر کے لئے زیادہ موزوں پرندکا نام ہے، جہاز کے ارد گرد منڈلا رہے تھے۔ بعض طیاروں نے تو خوب ہی کرتب دکھائے اور جو لطف ہینڈن کی طیارہ گاہ جاکر ۲۰ جون کو حاصل ہوا تھا وہ جہاز پر ایک حد تک ۱۴ جون کو حاصل ہو گیا۔ جہازوں پر سے بھی گولہ باری کی مشق ہو رہی تھی اور اسی طرح ہماری سلامی دی جا رہی تھی۔ مالٹا بالکل ویران سا اور تقریباً غیر آباد جزیرہ ہے لیکن اربوں بلکہ کھربوں روپیہ اس پر صرف کیا جا چکا ہے اور ایک ایک جہاز کروڑوں کی لاگت کا وہاں لنگر انداز رہتا ہے۔ توپیں بھی ہیں اور فوج بھی اور طیارے بھی، پانی میں سرنگیں بھی ضرور لگی ہوں گی، زرہ بکتر سے بھی قلعہ محفوظ ہوگا۔ مال و زر، محنت، دماغی قابلیت اور ہر طرح کی قربانیاں کونسی چیز ہے جو اس ویران جزیرہ پر نثار نہیں کی جا چکی۔ لیکن کس لئے؟ نہ اِسلئے کہ انسانوں کو زندہ رکھا جائے یا ان کی مادی یا روحانی اصلاح کی جائے بلکہ صرف اس لئے کہ انسانوں کو انسان زیادہ تیزی کے ساتھ ہلاک کر سکے۔ سائنس کے تازہ سے تازہ انکشافات اسی ایک مہلک مقصد کی نذر ہوتے رہتے ہیں اور اس کا نام تہذیب اور امن ہے، میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کا میرے دل پر کتنا اثر ہوا اور نہ صرف دو گھنٹے ہم نے مالٹا کے ساحل کے پاس گذارے بلکہ وہ سارا دن اور در اصل کم سے کم مارسیلز پہنچنے تک سارا وقت اِسی میں گذرا کہ کیا اسی کا نام ارتقاء ہے اور کیا ساری دنیا کو ایسی تہذیب کی تقلید کرنا ہوگی۔ اس کے بعد بار بار اقبال کے وہ شعر یاد آتے تھے کہ ؎

اے سوار اشہب دوراں بیا — اے فروغ دیدہ امکاں بیا

رونقِ ہنگامہ ایجاد شو، — در سواد دیدہا آباد شو،

شورشِ اقوام را خاموش کُن — نغمہ خود را بہشت گوش کُن

خیز و قانون اخوت ساز دہ — جام صہبائے محبت باز دہ

باز در عالم بیار ایامِ صلح، جنگجویاں را بدہ پیغامِ صلح
نوع انساں مزرع و تو حاصلی کاروانِ زندگی را منزلی
ریخت از جورِ خزاں برگ و شجر چوں بہاراں بر ریاضِ ما گذار
سجدہ ہائے طفلک و برناؤ پیر از جبینِ شرمسارِ ما بگیر
از وجودِ تو سر افرازیم ما پس بہ سوزِ ایں جہاں سازیم ما

دیکھئے سبل السلام تک دنیا کب اور کس طرح پہنچتی ہے۔ ابھی تو "ہمدرد" میں جواہر لعل نہرو کے اس مضمون کا ترجمہ پڑھا ہے جو کانگریس کے آنیوالے اجلاس کے صدر (خدا نہ کرے کہ صدر کے بیٹے) نے شاہ امان اللہ خان کے کابل پہنچنے پر لکھا ہے اور جس میں ظاہر کیا گیا ہے کہ ہندوستان کی سرحد پر جنگ کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ دو تین روز ہوئے کہ میں نے ایک نہایت عمدہ ناٹک دیکھا جس کا نام THE ENEMY یا غنیم تھا جس میں گذشتہ جنگ چھڑ جانے جاری رہنے، صلح ہونے اور صلح ہو جانے کے بعد کے حالات کا نقشہ دکھایا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ جنگ حقیقتاً کیسی غیر فیصلہ کن چیز ہے اور فاتح اور مفتوح دونوں کو کس طرح تباہ کرتی ہے اور غنیم حقیقتاً کوئی دوسری قوم یا ملک نہیں ہوتا بلکہ خود ہمارا البغض، کینہ، حسد، ضد اور ہٹ دھرمی ہی ہر جنگ میں غنیم ہوا کرتی ہے۔ سب سے آخری سین باوجود گذشتہ جنگ کے اس سبق کے یہ تھا کہ جن خاندانوں کے بڑے گذشتہ جنگ میں مارے گئے یا بے دست و پا ہو کر یا مخبوط الحواس بن کر پھر گھر آئے اور نان شبینہ تک کے لئے محتاج ہوئے۔ انہی کے ننھے بچے سپاہیوں کی وردی پہنے، کھلونوں کے ہتھیار سے مسلح فوجی بگل اور ڈرم بجاتے کھیلتے پھرتے ہیں جس سے صاف ظاہر ہے کہ دنیا اس جنگ کے سبق کو بھی بہت جلد بھول گئی اور اسے بار بار آموختہ پڑھنے کی ضرورت ہے۔

ایک اور خیال مالٹا کو دیکھکر دل میں بار بار آتا تھا اور وہ شیخ الہند مرحوم کی قید کا خیال تھا جس کے دوران میں وہ اپنی صحت اسی جزیرہ میں کھو چکے تھے۔ اب سفر کے آخری دن تھے۔

فرانس کے ساحل پر اکثر مسافروں کو اترنا تھا۔ میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ رفتہ رفتہ بہت سے انگریزوں سے مجھ سے علیک سلیک کے مراسم پیدا ہو چکے تھے۔ اور چند مجھ سے تفصیل کیساتھ گفتگو اور دوستانہ طریقہ پر سیاست کے متعلق بحث بھی کر چکے تھے۔ اسی دن ایک معقول فوجی افسر نے مجھ سے پوچھا کہ آپ جو یہ خلافت کا تھیلہ گلے میں ڈالے ہوئے ہیں یہ کس لئے ہے۔ اب خلافت کیسی۔ اب تو ترک اس کو منسوخ کر چکے۔ چونکہ وہ میرے خیالات سننا چاہتے تھے۔ اسلئے میں نے انی جاعل فی الارض خلیفہ کی تفصیل کیساتھ اس کی تفسیر سنائی اور بتایا کہ اسلام کن عقائد کا نام ہے جو سارے عالم میں پھیلانا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ اور خلافت کس طرح ان عقاید کی استحکام و تبلیغ کے لئے ایک ادارہ ہے۔ ان کو ان خیالات کو سن کر سخت حیرت ہوئی اور کہنے لگے کہ ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ آپ دونوں بھائی صرف انگریز کے خون کے پیاسے ہو اور ہندوستان میں قتل و غارت کے متمنی۔ مگر جس فلسفہ کی آپنے تشریح کی وہ تو لا اکراہ فی الدین پر مبنی ہے اور دنیا میں اتحاد و اخوت پھیلانے کا فلسفہ ہے۔ گو میں نہیں کہہ سکتا کہ قابل عمل ہے یا نہیں اور بانی اسلام نے اس کی تعلیم دی تھی یا نہیں۔ اس کے بعد پوچھا کہ یہ لباس جو آپ پہنے ہوتے ہیں، یہ بھی مذہبی لباس ہے۔ اس پر میں نے کہا کہ مذہب کو لباس کے فیشن سے کیا واسطہ وہ کوئی RITUALS مناسک کی OLD CURIOSITY SHOP ازمنہ ماضیہ میں رائج انوکھی اشیاء کی دوکان تو ہے نہیں، وہ تو اس دنیا کو صحیح طور پر برتنے کے طریقہ کا نام ہے۔ اور اس میں صرف وہی اصول بتائے گئے ہیں جو ازلی اور ابدی ہیں اور پھر میں نے ہنس کر کہا کہ البتہ میرا مذہب مجھے اس کا ضرور حکم دیتا ہے کہ میں بھی ناف سے گھٹنے تک اپنے جسم کو چھپائے رکھوں اور یہ مردوں کے لئے بھی ستر عورت ہے، اس لئے میں وہ لباس نہیں پہن سکتا جو چند میمیں ہر روز صبح کو پہنکر کے جہاز کے اس حوض میں تیرا کرتی تھیں جسمیں نیچے کے کھلے تنق پر ہر صبح بھر دیا جاتا تھا اور جہاں وہ بلا تکلف رانیں کھول کر مردوں کے ساتھ تیرا کرتی تھیں۔ ارے بھائی!" ہمدرد میں دیکھتا ہوں کہ ملکہ ثریا کے واپس آنے پر شرعی پردہ کی

بحث چھڑی ہوئی ہے۔ قرآن کریم کی آیات کی تفسیریں کی جا رہی ہیں۔ میں اپنے مہذب نئے فقہاء سے پوچھتا ہوں کہ پیرس اور لندن کی سڑکوں پر غضِ بصر کس طرح کروں۔ اگر آنکھیں نیچی کرتا ہوں تو دس بار عورتوں اور مردوں سے سڑک پر تصادم ہوتا ہے اور سڑک کے اس پار جانا چاہتا ہوں تو موٹروں، ٹریموں اور بسوں کے نیچے کچلا جاتا ہوں اور نظر اٹھا کر دیکھتا ہوں تو ؎

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل مے کشد کہ جا اینجا است

ایک ہمارے دلفگار شاعر نے لکھا تھا کہ ع

تن ہمہ داغ دار شد پنبہ کجا کجا نہم

اس غریب کو کیا خبر تھی کہ دل فگار کرنے والی حسینیں اس سے زیادہ مشکل میں مبتلا ہوں گی۔ اگرچہ تن پر ایک داغ بھی نہ ہوگا اور تنِ عریاں چھپانے میں مشکل پیش آئے گی کہ پنبہ کجا کجا نہم۔ مارسیلز سے چلتے وقت میں نے ریل میں پڑھنے کے لئے یہاں بہت سے انگریزی اخبار لئے تھے وہاں فرانسیسی سیکھنے کی غرض سے ایک فرانسیسی کا مصور رسالہ بھی اٹھا لیا تھا۔ ریل میں بیٹھ کر دیکھا تو مشہور و معروف LA VIC PARISIENNA (پیرس کی زندگی) ہے، اس کے بیچ کے دو صفحوں پر ایک تصویر تھی جس کا عنوان "پیرس کے اسٹیشن پر ارنجے گاڑی" تھا اس وقت غالباً تمام دوکانوں کی ملازمائیں اور خرید کرنے والیاں ادھر ادھر سے آتی ہونگی۔ لیکن تصویر میں تھا کیا، خدا جھوٹ نہ بلوائے تو کوئی تین چار ہزار برہنہ نما ٹانگیں تھیں۔ برہنہ نما اس لئے کہ حقیقتاً موزوں سے مستور تھیں لیکن موزوں کی رنگت ساق سیمیں کی رنگت ہوتی ہے۔ اس لئے وہ برہنہ نہیں، برہنہ نما ہوتی ہیں۔ غالب صاحب تو فرما چکے ہیں کہ ؎

ہے پرے، سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہلِ نظر، قبلہ نما کہتے ہیں،

لیکن آپ ہی بتلایئے کہ یورپ کے "اہلِ نظر" ان برہنہ نما ٹانگوں کو برہنہ نہیں سمجھتے تو کیا۔ اگر برہنہ تصور نہیں کرتے تو پھر عورتیں ہی کیوں اس رنگ کی جرابیں پہنتی ہیں، اور مرد کیوں سیاہ اور آسمانی اور اور رنگ کے موزوں سے، اور بالعموم کہیں زیادہ دبیز موزوں سے اپنے پیروں کو ڈھانکتے ہیں اور اس پر بھی اس گرمی کے زمانہ میں جبکہ بقولِ اخبارات کے گرمی کی شدّت سے امسال گھاس کے پولوں تک میں آگ لگ گئی (یہ پولے بھی گورے پولے ہیں ورنہ ہندوستان کے کالے پولے میں کبھی آجتک آگ نہیں لگی) فلالین اور کشمیرہ کی پتلونیں چڑھائے ہوتے ہیں۔

اب میرے سفر کو بھول جایئے اور سمجھ لیجئے کہ لندن آ گیا اور میرے شاگرد رشید جنہیں جامعہ چھوڑ کر نام نہاد مسلم یونیورسٹی چلے جانے کے بعد سے مرتد کہا کرتا ہوں (یاد رکھئے میرے مذہب میں قتلِ مرتد جائز نہیں صرف قتلِ مفسد جائز ہے) اشرف صاحب اور ظفر عمر صاحب (نیلی چھتری) کے صاحبزادہ شوکت عمر صاحب اور جوناگڈھ کے سابق جج اور علیگڈھ کالج کے اولڈ بوائے امین فقیہہ صاحب کے صاحبزادہ خالد، اور عبد الغنی صاحب سشن جج کے صاحبزادہ اور حیات صاحب کے "سالار جنگ" "ٹلی" صاحب مجھے لینے وکٹوریہ اسٹیشن پر آ گئے ہیں اور معہ میرے سامان کے ٹلی صاحب کی موٹر میں لا چکے ہیں اور عبد الرحمٰن صاحب صدیقی کے رفیقِ کار حیدر اور سعید الدین احمد صاحب پرتاب گڈھ کے وکیل جو اپنے صاحبزادہ فیاض صاحب کو دیکھنے آتے ہیں (جو یقیناً یخرج الحی من المیت کی مثال ہے، کئی گھنٹہ کی ARTIFICIAL RESPIRATION اب ڈاکٹر سعید احمد صاحب اس کا ترجمہ کریں، میری رائے میں استنفاس ہونا چاہئے) کے ذریعے نبض ساقط ہونے کے کئی گھنٹے بعد مرکر جئے تھے) کیساتھ اس کے پیچھے ٹیکسی میں تشریف لا رہے ہیں۔ اشرف اور شوکت صاحب کی دعوت پر انہیں کے گھر قیام کیا جاتا ہے اور دوسرے دن ڈاکٹر سے پوچھ کر اسی مکان کو اپنی فرودگاہ بنایا جاتا ہے لیکن باوجودیکہ گھڑی رات کے ۹½ بجا رہی ہے۔

یہاں ابھی مغرب کا وقت بھی نہیں ہوا ہے (یاد رکھئے کہ وسط اپریل سے یورپ میں SUMMER TIME ہے گھڑیاں سورج سے ایک گھنٹہ آگے ہیں اور درحقیقت یہاں ۸½ بجے ہیں) اس لئے اسی وقت فیصلہ کیا جاتا ہے کہ ویسٹ اینڈ (مغربی حصہ) جو یہاں کے متمول طبقہ کے رہنے اور خرید و فروخت اور عیش و عشرت و تفریح وغیرہ کا مرکز ہے چل کر شفیع نامی RESTAURANT ریسٹران میں ہندوستانی کھانا اُڑایا جائے۔ ہم جانتے ہیں کہ زندگی کے یہ آخری لمحے ہیں۔ کل بارہ بجے ڈاکٹر سے ملاقات ہوگی اور ۱۲ دن کا فاقہ شروع ہو جائے گا۔ جتنی بد پرہیزی ہو سکے آج ہی کر لی جائے، چنانچہ پلاؤ، کوفتے، مچھلی، قلیہ، شامی اور سیخ کے کباب پراٹھوں سمیت اور گلاب جامن اور رس گلے اور جلیبی اور ربڑی سب زہر مار کی جاتی ہے اور اس سے فارغ ہو کر تقریباً رات کے بارہ بجے ہوٹل CECIL سیسل جا کر بچارے سر نیو اس آئنگر کو سوتے سے جگا کر خود اپنے آنے کی اطلاع دیجاتی ہے، لیکن بالآخر ان پر رحم کھا کر گھر واپس آیا جاتا ہے۔ دوسرے دن بارہ بجے ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کا وقت حیدر صاحب مقرر کر چکے ہیں، اس لئے ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے میری علالت کی ساری سرگذشت سُنی، میرا وزن کیا، میری کمر ناپی، اور ایک آلے میں مجھے پھُنکوا کر میری سانس تک کی پیمائش کی، اور دوسرے دن میرے قارورہ کا امتحان کرایا پھر اس طریقہ علاج کی تشریح کی جس کو NATURO THEROPENY کہتے ہیں۔ اور جس کے متعلق میں اس سے پیشتر جعفری صاحب کے ذریعہ ڈاکٹر سعید صاحب کو اپنے معالج کرنل آسٹن R.A.M.G. (رائل آرمی میڈیکل کور) کی تحریر و تقدیر کی ایک مطبوعہ نقل "ہمدرد" میں شائع کرانے کے لئے بھیج چکا ہوں۔ آج ہی میں نے بیگم صاحبہ کو پوری تفصیل کیساتھ اس طریقہ کی تشریح لکھ بھیجی ہے جس کے مطابق میرا علاج ہو رہا ہے اور اب تک جو حیرت انگیز نتائج حاصل ہوئے ہیں ان کی بھی تصریح کر دی گئی ہے۔ اس لئے یہاں میں کچھ زیادہ لکھنا ضروری نہیں سمجھتا۔

ڈاکٹر صاحب سے کھانے اور ورزش کے متعلق ہدایات لیکر میں الور کے وزیر اعظم راؤ
کرو عاری لعل صاحب سے ملنے ہائڈ پارک ہوٹل گیا اور انہیں کے ساتھ کوئنس کلب میں جاکر امریکہ
کے ٹینس کھیلنے والوں ٹلڈن، ہنٹر اور بچہ کوہین COHEIN اور جرمنی کی بچی "فرالائن
آسم FRAULINE ASSIM کو ٹینس کھیلتے اور جیتتے دیکھا۔ چونکہ اس کے بعد
ومبلڈن کا مشہور ٹورنامنٹ بھی ہوا جسے دیکھنے میں کئی بار گیا، اس لئے ان کے کھیل کی تعریف
میں اسی کے سلسلہ میں کرونگا۔ یہاں اسی قدر لکھنا کافی ہے کہ میں نے ٹلڈن کو دیکھکر ہی
جانا کہ ٹینس کے بلّے سے کیا کیا سحرکاری کی جاسکتی ہے۔ شب کو گروھاری لعل صاحب نے
دعوت دی کہ چلو آج تاج محل RESTAURANT ریسٹوران چل کر (جو
ہماری دلی ہی کے ایک ہندوستانی بھائی کی دوکان ہے) ہندوستانی کھانا کھاؤ۔ وہاں گیا
اور یہ پہلا کھانا تھا کہ جس میں روٹی بالکل ترک کردی گئی اور میں نے اس سبق پر عمل شروع
کیا جو گیہوں کھانے کے بعد جنت سے نکالے جانے کے بعد مورثِ اعلیٰ نے سیکھا تھا۔
وہ دن ہے اور آج کا دن، روٹی ایک بار نصیب نہیں ہوئی، اور بار بار جی چاہتا ہے کہ
میں بھی یہاں کے متشرع عیسائیوں کی طرح ہر روز دعا مانگوں کہ

GIVE US THIS DAY OUR DAILY BREAD

(آج ہمیں ہماری ہر روز کی روٹی دلوا) روزی کی دعا نہیں بلکہ روزانہ روٹی کی
مانگی جاتی ہے۔ اس ریسٹوران میں ہمارے دہلی کے تعلیمیافتہ تاجر بدر الاسلام صاحب کے
بھائی مصباح الاسلام ملے اور انہوں نے بھی ہمارے ہی ساتھ کھانا کھایا۔ دوسرے دن
سے صرف دو وقت کا کھانا ملا اور اس میں سے کم سے کم ایک وقت صرف پھل کھانے
کو ملے۔ اور گذشتہ چالیس دن میں سے ۸ دن فاقہ کرنا پڑا۔ اس میں سے بھی ایک میں صرف
پھل کھانے کو ملیں گے، گو اس کا ضرور شکر گذار تھا کہ ڈاکٹر نے چھوٹتے ہی ۱۲ دن کے فاقہ
کا حکم نہیں دیا؛ مگر اب جبکہ دو بار فاقے کر چکا ہوں، ایک بار مسلسل تین دن اور دوسری

بار پانچ دن اور اس وقت پانچ دن گذر جانے پر نہاتا کٹا اطمینان سے بیٹھا ہوا ہوں اور رات کے بارہ بج چکے ہیں، لیکن پھر بھی مطلق تھکا نہیں ہوں، پورے اطمینان کے ساتھ یہ فیصلہ کرنے کے لئے تیار ہوں کہ اگر یہی حال رہا تو ساری عمر نہایت خوشی سے دن رات میں صرف ایک ہی وقت کھانا کھا کر گذار دونگا۔ اور وہ بھی اکثر محض پھلوں پر مشتمل ہوگا۔ اس کے بعد سے بجائے اپنے روزنامچہ کے (شبنامچہ، دوپہرنامچہ، سہ پہرنامچہ وغیرہ کا اب بھی ذکر نہیں ہے) ان خاص مواقعات کے حالات دونگا۔ جو مجھ کو یہاں کے قیام میں پیش آتے ہیں یا آیا کریں گے۔ لیکن چونکہ یہ خط اب بھی لمبا ہوگیا ہے۔ اس لئے ومبلڈن کی ٹینس میچوں LORDS لارڈز کی کرکٹ میچ، HENDEN کی طیاروں کے کرتب اور ایک دو چھوٹی میٹنگ کا، کہ جن میں بحیثیت ایک وزیٹر (مہمان) کے شریک ہوا، آج کے خط میں ذکر نہیں کرونگا۔ نہ پارلیمنٹ کے اس مباحثہ کا جس میں مس سیوج کے ساتھ پولیس کے برتاؤ کی تحقیقاتی کمیشن کی دونوں رپورٹوں پر بحث ہوئی تھی اور جس میں شرکت کے لئے دارالعوام کے اسپیکر صاحب نے مجھے ممتاز " اجنبیوں STRANGERS " کی گیلری میں بیٹھنے کا ٹکٹ دیا تھا، یہ سب چیزیں علیحدہ علیحدہ خط چاہتی ہیں، اور انشاءاللہ کبھی نہ کبھی آئندہ خط میں ان تمام حالات کو پیش کر دیا جائیگا۔ ان کے علاوہ جن تھیٹروں، یا سینماؤں میں میں گیا ہوں ان کا ذکر بھی علیحدہ خط ہی میں مناسب ہے، اور ایک خاص خط تو انشاءاللہ اس موضوع پر لکھا جائیگا۔ کہ میں نے کن کن جگہوں میں، اور کس مشکل سے ظہر و عصر و مغرب کی نمازیں ادا کی ہیں۔ جن صاحب نے نہایت بلند آہنگی سے فرمایا تھا کہ ؎

اذاں دی کعبہ میں ناقوس دیر میں پھونکا

کہاں کہاں ترا عاشق، تجھے پکار آیا،

ان کی ساری شیخی کرکری ہو جائے گی، جب میں بتاؤں گا کہ میں نے کہاں کہاں چھپ چھپ کر نمازیں ادا کی ہیں۔

برادرانِ من، مہذب ممالک کا اصول ہے کہ ہر چیز کے لئے ایک جگہ ہوتی ہے اور ان کے نزدیک میل کچیل اور غلاظت کی تعریف صرف یہ ہے کہ مادہ اپنی مناسب جگہ کے علاوہ کہیں اور ہو۔ عمدہ سے عمدہ کھانا، اگر وہ باورچی خانے یا کھانے کی میز پر نہ ہوگا، یا کڑاہی، دیگچی یا پلیٹ پیالہ کے باہر ہوگا، مثلاً آرام کرسی اور سوفا SOFA پر قالین پر، تو وہ میل کچیل یا غلاظت ہے اور میں بھی اس مختصر تعریف DIRT IS MATTER OUT OF PLACE کا قائل ہوں۔ اب سنئے کہ اس ملک کے لوگوں نے خوب اچھی طرح سوچ کر ایک جگہ بنا دی ہے اور اگر وہ چیز اس جگہ کے علاوہ تھوڑی دیر کے لئے بھی کہیں اور نظر آجاتی ہے، تو وہ چلا اُٹھتے ہیں کہ یہ کیا گندگی پھیلا رکھی ہے۔ چنانچہ یقین کیجئے کہ مجھے اپنے گھر کے غسل خانہ میں بھی کھڑے ہوکر غسل یا وضو کرتے میں، اس کی سخت احتیاط کرنی پڑتی ہے کہ پانی کی ایک بوند بھی ٹب، یا منہ دھونے کے برتن کے باہر جاکر لکڑی کے فرش پر نہ گرنے پائے، لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ اس غور و فکر کرنے والی قوم نے بھی پہلے سے سوچ کر کوئی جگہ ایسی نہیں نکالی جہاں ایک اللہ کا بندہ نماز پڑھ سکے، چنانچہ میں آپ سے سچ عرض کرتا ہوں کہ کھدر کا لباس پہنکر انگلستان جیسے ملک میں باہر نکلنا، جہاں آجتک لوگوں کے اس پر استعجاب و حیرت کا خاتمہ نہیں ہوا، کہ دنیا میں سفید رنگت کے علاوہ بھی لوگ ہوا کرتے ہیں، اور ہر ملک میں ایک ہی لباس رائج نہیں ہے، اتنا مشکل نہیں ہے جتنا کہ سارے ملک میں اپنی خوابگاہ کے باہر کہیں کھڑے ہوکر نماز پڑھنا، لیکن میں اس نئی دنیا کا کولمبس ہوں اور جس طرح کھدر اور عبا قبا کا یہاں کے لوگوں کی نظروں کو عادی بنا رہا ہوں، اسی طرح رکوع و سجود کے منظر کا بھی، اور اگر بیگم صاحبہ اور بچیاں بھی یہاں آجائیں تو شاید ان کی آنکھیں برقعہ دیکھنے کی بھی عادی ہو جائیں۔

میرا ارادہ تھا کہ میں اس خط میں آپ کو کم سے کم اس جلسے کے حالات لکھ بھیجتا جو ۲۴ جولائی کو کنیکسٹن ہال میں ہوا تھا اور جس میں مہاراجہ صاحب پٹیالہ نے ہندوستانی

ریاستوں اور حکومت ہند کے تعلقات پر ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن کے جلسہ میں اپنا لیکچر پڑھکر سنایا تھا، اور اس پر حیدر آباد کے دو ریذیڈنٹوں، پنجاب کے دو گورنروں نے ایک وفادار اور دو باغی ہندوستانیوں نے تقریر کی تھی، اور ایک سکھ نے ایک ہندوستانی اخبار پڑھکر سنایا تھا، اور لارڈ کرزن کے ایک سابق پرائیویٹ سیکرٹری نے صدارت فرمائی تھی، لیکن یہ موضوع بھی وسعت طلب ہے۔ اس لئے آج اس پر بھی قلم نہیں اٹھاتا، اور نہ اسکے متعلق ان اخبارات کے اقتباسات ہی بھیجتا ہوں جو گذشتہ جمعرات ہی کو میں نے نکال لئے تھے، اس لئے کہ اس جلسہ میں شرکت کے لئے حاضر ہونے کے بعد ہی ایک بنگالی طالب علم سے میرے ٹیکسی والے کی لڑائی ہوگئی اور بنگالی نے بالآخر ٹیکسی والے کی ناک پر ایسا گھونسہ جمایا کہ اس کی نکسیر پھوٹ گئی اور اس جرم میں انہیں پولیس کنسٹیبل ویسٹ منسٹر کے تھانہ میں لے گیا، اور وہ حاضری کے لئے مچلکے دے کر چھوٹے اور دوسرے دن مجسٹریٹ کے سامنے پیش کئے گئے۔ اور گو سزا پانے سے بچ گئے مگر ٹیکسی والے کو دو پونڈ خرچہ دینا پڑا اور مجھے جاکر گواہی دینی پڑی اور ان کے عوض بیرسٹر اور سالسٹر کو ۵ پونڈ، ۳ شلنگ ۶ پنس دینا پڑے۔ امید ہے کہ میرے ان پرجوش بنگالی بھائی کو ایک سبق حاصل ہو گیا ہوگا لیکن یقیناً ٹیکسی والے کو اس کی گستاخی اور پاجی پن کا کچھ بھی ثمرہ نہ ملا اور بجائے ۶ پنسی جرمانہ انعام کے وہ ایک گھونسہ اور ۲ پونڈ لے مرا۔ چونکہ یہ داستان پر لطف بھی ہے اور لمبی بھی، اس لئے اس کو بھی اگلے خط کے لئے ملتوی کرتا ہوں، اگرچہ اسکے سنانے کا گذشتہ جمعرات ہی کو ارادہ تھا۔ آج چھٹا دن ہے کہ نارنگی اور انگور کے عرق کے سوا حلق کے نیچے کچھ نہیں اترا ہے اس لئے آج اسی پر اکتفا کروں تو شاید مضائقہ نہ ہو گو یا یقین کیجئے کہ مجھے آج بھی مطلق بھوک نہیں معلوم ہوتی اور اس وقت ۱۱½ بجے چھٹے دن میں یہ معلوم نہیں ہوا کہ میں نے رات ....

کھانا نہیں کھایا تھا۔ بالکل ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ حسب معمول رات کھانا کھاکر سویا ہوں اور دیر میں اٹھا ہوں، اس لئے اب تک منہ دھوکر ناشتہ نہیں کیا ہے یقین جانئے کہ میں آپ کے قلاش اور مفلس ملک کے لئے دولت کمانے کا ایک نیا نسخہ لیکر آرہا ہوں وہ یہی ہوگا کہ ہر مریض سے فاقہ کرایا جاوے، اور کون ہے جو اس ملک میں مریض نہیں پھلوں کا عرق پینا ہی کئی دِن کے لئے کافی ہو سکتا ہے، اور ہندوستان میں انگور نہ سہی مگر نارنگیاں اور گنّے تو سستے ہیں۔ اچھا اب رخصت فی امان اللہ۔ میں نے بیگم صاحبہ کے خط میں اپنے علاج اور اپنی صحت میں ترقی کی پوری تفصیل دیدی ہے، وہ خط ان سے منگاکر پڑھ لیجئے گا۔ والسّلام۔

آپ کا بھائی
محمد علی

(۸)

پیرس میں چند دن

ہوٹل واگران۔

ژاروین دے تولیری۔ پیرس

پیارے السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

دیکھو تقدیر بلا تدبیر کہاں کھینچ لاتی ہے۔ میں ۱۶ ر کی شب کو پیرس پہنچا۔ چونکہ لندن میں جب ڈاکٹر سے فارغ ہو جاؤنگا تو ارادہ ہے کہ فرانس میں کسی اچھی جگہ جہاں تنہائی بھی نصیب ہو جائے رہوں۔ اس لئے دو تین دن یہاں رہنے کا قصد کیا تاکہ ڈاکٹر بہجت وہبی ، دو والدام[1] ، شوکت اللہ شاہ (ڈاکٹر انصاری صاحب کے بھانجے) اور یوسف حسین خان (ڈاکٹر ذاکر حسین خان صاحب کے چھوٹے بھائی) وغیرہ سے مل کر طے کرلوں کہ کہاں یہ سب چیزیں اس طرح مل سکتی ہیں کہ گرانی سے بھی بچ سکوں۔ مارسیلز صبح کو جہاز پہنچا تھا۔ جلد اگاڑی پچھاڑی تڑا کر اسٹیشن پہنچا اور ساڑھے نو بجے دن کے پیرس کو جانے والی تیز گاڑی میں روانہ ہوا۔ چلنے سے پیشتر ایک تار "رالقوم" یعنی "راحت لقوم" (ڈاکٹر بہجت وہبی) کے نام دیا اور دوسرا "سنتزن" یعنی افتخار کی دکان" ہندوستان" کے نام جہاں دو والدام[1] دو گھنٹہ روزانہ کام کیا کرتے ہیں۔ اب دیکھئے کہ وہبی نے اپنے کارخانہ کا تار کا پتہ کچھ عرصہ

---

[1] نام ژاک دو والدام۔ ایک ترکی پاشا کے صاحبزادے تھے، ماں آسٹرین تھی، پیرس کے چھوٹے بڑے حلقوں میں بڑے ہر دلعزیز تھے۔ مولانا سے ۱۹۲۰ء کے سفر میں تعارف ہوا تھا صاحب موصوف بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ اور پیرس کی زندگی کے نشیب و فراز کو اچھی طرح سے جانتے تھے۔

سے بدل دیا ہے اور خود بھی اب سان کلو (ST. CLOUD) میں - جو
وارسائی (VERSAILLES) کے راستہ میں بوادی بولان
BOIODE BOULOGNE سے نکل کر پڑتا ہے اور
جہاں ان کا کارخانہ راحت لقوم تیار کرنے کا ہے نہیں رہتے - بلکہ پیرس
کے ایک ہوٹل میں مقیم ہیں، اس لئے تار نہ ملا - افتخار کی دوکان پر تار اس
دن کسی کو نہ ملا - ہفتہ تھا، شاید بند ہوگئی ہو، ایک پولش (پولینڈ کی
رہنے والی) لیڈی اس کی دیکھ بھال کرتی ہے - ان کو دوسرے دن
صبح کو ملا وہ والدام ہفتہ اور "اتوار" ایک دوست کے ساتھ جن کے پیرس
کے مکان میں وہ نولی (NEVILLY) میں رہتے ہیں - دوویل
(DEAWILLE) کے ساحل پر گذارا کرتے ہیں، وہ بھی نہ تھے -
میں نے تار میں لکھ دیا تھا کہ انصاری کے بھانجے شوکت اللہ شاہ کو
اطلاع کر دینا - وہ بزرگ دہلی سے شروع مئی میں رخصت ہوئے تھے - ہم
سب ان کو اسٹیشن پر جا کر رخصت کر آئے تھے - مگر یہ لطف دیکھئے کہ پرسوں
شب خود میں نے جا کر ان کا ہندوستان سے ان کی مراجعت پر اسٹیشن
پر استقبال کیا - حیدر آباد بھائی اصغر سے ملنے گئے تھے - وہاں سے اوٹی
چلے گئے دہلی میں بھابی اور غالب تک کو خبر تک نہ تھی کہ ولایت چل دیئے کہ
نہیں - انصاری تھے نہیں - ورنہ چونکہ ان کو خط لکھا تھا اس لئے اُن سے
معلوم ہو جاتا - اب جب پیرس کے اسٹیشن پر کوئی نہ ملا تو ارادہ کیا کہ ہوٹل واگران
(HOTEL WAGRAN) ہی چلا جاؤں، آرام بھی ملے گا اور سب سے
سستا بھی ہے - چنانچہ سب سے سستا سونے کا کمرہ مانگا - ایک مختصر سا
سونے کا کمرہ اور اس کے متصل بیٹھنے کا بھی مختصر ہی سا کمرہ خالی تھا دہ سو فرانک

روز پر مل گیا یعنی دس روپیہ روز پر۔ ایک بار اسی قسم کے کمروں میں چند روز کے لئے رہے بھی تھے، مگر نیچے کی منزلوں میں غالباً ۱۵۹-۵۰ میں۔ یہ چوتھی منزل پر ہیں۔
دوسرے دن صبح ہوتے ہی شوکت اللہ شاہ ہی کے گھر کا رُخ کیا اس خوف سے کہ زبان نہ جاننے سے کہیں بھٹکنا نہ پڑے بس یا میٹرو کی جگہ ٹیکسی لیکر گیا۔ یہ معلوم نہ تھا کہ یہاں شوکت صاحب پیرس کے باہر نواح میں رہتے ہیں یا رہتے تھے، ورنہ یوسف حسین کے پاس چلا جاتا جو پیرس ہی میں مقیم ہے اور بہت سے فرینک بچ جاتا۔ قدم قدم پر ۵ سان (CENT) بڑھتے تھے اور دم خشک ہو رہا تھا، مگر حساب لگایا تو معلوم ہوا کہ صرف ۵ پائی بڑھ رہی ہیں، اس لئے کہ فرینک بیچارہ خود پونے دو آنہ سے زیادہ نہیں۔ تب جا کر قلب کو کہیں اطمینان ہوا۔
بورگ لارین حدود پیرس کے باہر ہے شوکت اللہ صاحب جس مکان میں رہتے تھے اس کے مالک سے ملاقات ہوئی اور معلوم ہوا کہ وہ نہیں ہیں۔ پوچھا رہتے تو یہیں ہیں، تو معلوم ہوا کہ یہیں رہتے تھے۔ پوچھا کہیں باہر گئے ہیں تو ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں جواب ملا کہ وہ تو آئے نہیں ہیں میں نے پوچھا کہاں سے؟ تو معلوم ہوا کہ ہندوستان جنت نشان سے۔ پوچھا کب آئیں گے۔ کہا کوئی اطلاع نہیں، مگر ان کے نام کے خط آنا شروع ہو گئے۔ غالباً جلد آجائیں گے چنانچہ ان کی ڈاک میں اپنا خط بھی نظر آیا جو میں نے اپنے جہاز کی ٹکٹ سے ایک ہفتہ پیشتر ان بزرگ کے نام ڈالا تھا کہ میرے لئے ایک سستا سا کمرہ دو دالدام یا ڈاکٹر بھجت وہبی کے قریب ہی لے رکھنا۔ وہاں سے سخت پریشان ہو کر پیرس واپس آیا۔ اتفاق سے میاں باسط نے یوسف حسین سے ایک پونڈ قرض لیا تھا ایک لفافے میں اس کا ڈرافٹ بند کر کے مجھے دیدیا تھا کہ اسے مارسیلز سے ڈاک میں ڈال دیجئے مگر لطف یہ ہے کہ اس کا ذکر ہی نہیں کیا تھا کہ اس میں ڈرافٹ بند ہے اور ممکن تھا کہ میں اسے کھو دوں۔ احتیاطاً وہ خط بھی اٹیچی کیس سے نکال کر ہاتھ میں لے لیا تھا اس پر یوسف کا پتہ درج

تھا عبدالرحمٰن نے بھی ہیلیر ڈپائر[1] پر چند پتے لکھ دیئے تھے، ان میں بھی درج تھا اور وہ گلے میں لٹکے ہوئے "خلافت" کے تھیلے میں تھے چنانچہ اب اسی پتہ پر ساربون (SURBONE) کے پاس پہنچا۔ مکان ملا۔ گھنٹی بجائی، ایک عورت نے دروازہ کھولا۔ یوسف کا نام لیا تو اس نے فرانسیسی میں کچھ کہا اور سر اس طرح ہلایا کہ دل خوش ہوگیا پھر اس نے بتایا کہ پانچویں منزل پر ہیں، اور ابھی گھر ہی میں ہیں، حالانکہ کوئی گیارہ بج چکے تھے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ لفٹ (اُوپر جانے کیلئے برقی جھولا) نہیں ہے۔ مگر خوش خوش چڑھتا چلا گیا، حالانکہ سانس مجھ سے بھی پہلے چڑھ گیا۔ کمرہ کھٹکھٹایا اور بلا اجازت کا انتظار کئے ہوئے کھولا تو میاں یوسف کا خوبصورت چہرہ نظر آیا۔ ابھی سو کر اُٹھے تھے۔ لباس خواب پہنے ہوئے تھے۔ مجھ کھدّر پوش کو دیکھ کر عذر کیا کہ کھدّر کے کپڑے پھٹ گئے ہیں۔ ابھی لباس خواب (NIGHT DRESS) خریدا ہے۔ میں نے کہا چلو مجھے سب سے ملواؤ، اور جس کام کے لئے میں پیرس میں رُک گیا ہوں، اُسے پورا کرواؤ۔ فوراً داڑھی بنائی، جلدی میں گلا ناک کاٹ لیا اور پھر منہ ہاتھ دھو کر سوٹ اور بوٹ پہن کر میرے ساتھ نیچے اُترے، مگر اسی دن اور اسی وقت ٹیلیفون کی ڈائرکٹری میں شاہد سہروردی کی نظر سے یوسف حسین صاحب کے مکان کا نمبر گذرا جس سے معلوم ہوا کہ وہ بھی ٹیلیفون پر ہیں، اس لئے گھنٹی بجا کر بات کی۔ جو جواب میں سنا کہ میں ابھی ہندوستان سے آیا ہوں تو فتہمیں دلا کے اسی وقت (ویٹو ونیر) پر بلایا اور خود پکانے کا اہتمام کرنا شروع کیا۔ وہ بھی پیرس کے باہر BOIODE BOULOGNE (بواری بولان) کی طرف رہتے ہیں۔ ایک روسی کسان کی شکستہ حال بیوہ جس کا شوہر شاید مارا گیا اور جس کی زمین چھین لی گئی، ان کا کھانا پکاتی ہے۔ ایک روسی کتا جو صرف روسی سمجھتا ہے، ساتھ ہے۔ راستہ میں

---

[1] بمبئی بندرگاہ کی ایک گودی

ہم موسیو گاستان گیلرڈ (M. GASTON GAILLARD) کے گھر ہوتے گئے۔ یوسف کہتا تھا کہ وہ ہمارے اب تک بڑے مداح ہیں تو وہ بیچارے شب خوابی کے کپڑے پہنے ہوئے تھے اور شاید ابھی خط نہیں بنایا تھا اس لئے نیچے سڑک پر نہ آسکے اور مجھے بھی اوپر آنے کی تکلیف نہ دی مگر چار بجے ہوٹل آنے کا وعدہ کیا اور جب ہوٹل میں ملے تو ہمارے ساتھ چائے پی اور ایک ارمنی ریسٹوران میں ڈنر کی کھانے کی دعوت بھی دی۔

خیر اس وقت تو ہم ان کو دیکھے بغیر شاہد سہروردی کے ہاں گئے۔ خوب مزیدار کھانا خوب پیٹ بھر کر کھایا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ جہاز سے اُترے اور اس کے ڈھیروں مگر بدمزہ کھانوں سے نجات ملی۔ کھانے کے بعد امریکہ سے آئے ہوئے دھن گوپال مکرجی ملے۔ جنہوں نے متعدد عمدہ کتابیں تصنیف کی ہیں اور جن میں سے "My Brother's Face" کی میں نے ہندوستان میں ایک انگریز سے تعریف سنی تھی اور شاہد سے بھی انگلستان کے شاہی شاعر ڈاکٹر برجز نے بہت تعریف کی تھی۔ بالکل جوان آدمی ہیں۔ مجھے بھی امریکہ آنے اور لیکچر دینے کی دعوت دے رہے ہیں۔ شاہد کے ساتھ مزے مزے کی باتیں ہوئیں۔ بیچارہ بہت ہی قلیل تنخواہ پر بہت محنت اور بڑی قابلیت سے جمعیت اقوام کے بین الاقوامی ادبی ادارہ وغیرہ کا کام کر رہا ہے۔ واپسی پر گاستان گیلرڈ صاحب ہوٹل میں ملے وہیں سے ڈاکٹر وہبی کا پتہ لگا کر ان کو ٹیلیفون دیا اور وہ آکر ملے اور کھانا بھی ہمارے ہی ساتھ ارمنی ریسٹوران "حاجیان" میں کھایا۔ دوسرے دن معلوم ہوا کہ دیوان چمن لال ایم۔ایل اے پیرس آئے ہوئے ہیں۔ ایک بجے وہ خود ہی میرے آنے کا سُن کر ہوٹل آئے۔ شاہد سہروردی اور گیلرڈ کے ساتھ ڈاکٹر ان ہی میں لنچ کھا کر سفارت افغانی میں گیا اور سردار علی غلام نبی خان سے بھی ملاقات کی جب آپ پیرس تشریف لئے جا رہے تھے تاکہ جنرل نادر خان صاحب سے جو علیل تھے اور کسی قدر اب تک علیل ہیں، چارج لیں تو میں نے آپ کو دہلی میں شام کے کھانے پر مدعو کیا تھا اور حکیم صاحب رحمتہ اللہ علیہ بھی تشریف

لائے تھے۔ آپ کے بھائی غلام جیلانی صاحب تو حج بیت اللہ میں اور موتمر عالم اسلام میں ۱۹۲۶ء میں ہمارے رفیق تھے، اور ساتھ ہی طواف کیا کرتے تھے۔ وہ انگورہ میں سفیر تھے اور ہیں۔ غلام صدیق خانصاحب برلن میں تھے اور بمبئی میں بھی اعلیحضرت شاہ امان اللہ خان صاحب کے ہم رکاب تھے اور یورپ میں بھی غالباً اس تمام سفر میں ہمرکاب رہے۔ آپ نہایت محبت سے پیش آئے۔ واپسی میں باصرار سخت نیچے تک پہنچانے آئے اور اپنی ہی موٹر میں روانہ کیا، اور دوسرے دن لنچ کی دعوت دی۔ رات کو وہی نے بھی ارمنی دوکان میں یوسف کو اور مجھے ترکی کھانا کھلایا۔

یوسف بیچارہ ۱۷ کی صبح ہی سے ساتھ ہے اور ہر وقت ساتھ رہتا ہے اور میری ترجمانی کا کام کرتا ہے۔ مگر جہاں میری دعوت ہوتی ہے ہمراہ نہیں جاتا اور سمجھتا ہے کہ مغربی طریقہ پر صرف میں ہی مدعو ہوں۔ حالانکہ ہر جگہ میزبان نے پوچھا کہ یوسف کہاں ہیں۔ وہ بھی تو مدعو تھے۔ یہی افغانی سفارت خانہ میں دوسرے دن ہوا اور یہی رات ہمارے پرانے دوست شریف پاشا کے ہاں ہوا، اگر وہی ان کو بھی ساتھ ہی لے گئے تھے، اس لئے انہوں نے اپنے تئیں طفیلی نہیں سمجھا۔ خداوند کریم پوری کامیابی عطا فرمائے، لڑکا نہایت پیارا اور نہایت صالح اور سعادت مند ہے اور بڑی محنت سے تحقیقات میں مشغول ہے۔ فرانسیسی اب خوب بولنے لگا ہے گو میاں شوکت اللہ صاحب بہادر فرماتے ہیں کہ انکی فرانسیسی میں ابھی ہندوستانیت باقی ہے۔ ارمنی دوکان "حاجیان" میں ترکی کھانا دو بار کھایا۔ ترکاریاں سادہ زیتون کے تیل میں پکی ہوئی اچھی تھیں۔ مگر "مصالح" کا نام نہ تھا۔ بھائی کھانا تو ہندوستان میں بھی خوب پکتا ہے اور وہاں کے خراب گوشت تک کی اصلاح یہ مصالح کردیا کرتے ہیں۔ رام پور سے جلا وطنی اب تک جاری ہے مگر پھر وطن ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ شاید اب دنیا بھر میں سرکار کے دسترخوان سے بہتر کھانا کہیں نہیں پکتا۔ اور اگرچہ اس بار میں نے سخت پرہیز کیا تھا اور خالص انگریزی غذا اور اس میں

میں بھی چربی آنے کے باعث صرف مچھلی اور مرغی کھائی تھی لیکن ایک دن نہیں رہا گیا۔ تھوڑا سا شکردار جما ہوا دہی کھا لیا۔ اس کا مزہ اب تک آ رہا ہے۔ تمہارے پنجاب سے دودھ دہی کہاں اچھا ملے گا۔ مگر غضنفر علی خان ایم ایل اے کو چکھایا فوراً قائل ہو گئے۔ دوبار اس ارمنی دوکان میں اور تیسری بار افغانی سفارت خانہ میں ترکی "لیبنورٹ" بھی کھایا۔ جس کے بغیر ترکی نہیں سمجھتے کہ کھانا کھایا ہے۔ مگر رامپور کے شکردار دہی کی اور ہی بات ہے۔ ۱۹ کی صبح کو یوسف کو ساتھ لے کر ایرانی سفارت خانہ گیا۔ اور مرزا حسین خان علائی (بااعلیٰ) سے نیاز حاصل کیا میں ٹوٹی پھوٹی فارسی کوئی آدھ گھنٹہ بولتا رہا۔ یوسف نے فرانسیسی سے کام لیا، اور معلوم کیا کہ بے حد خوب بولتے ہیں اور مدتوں سے یورپ میں رہتے آئے ہیں، کیوں نہ بولیں گے۔ ایک بار وہ کچھ ہماری دونوں کی انگریزی سُن کر انگریزی میں بھی ایک فقرہ بول گئے تھے تب جا کر معلوم ہوا کہ انگریزی بھی خوب بولتے ہیں اور پھر تو کوئی گھنٹہ بھر انگریزی ہی میں باتیں ہوتی رہیں۔ نہایت اصرار سے فرمایا کہ آپ ضرور ایران ہو کر واپس جائیں۔ دیکھو صحت کیسی رہتی ہے۔ روپیہ کتنا خرچ ہوتا ہے! اگر جلد اچھا ہو گیا اور روپیہ بھی کچھ بچ گیا تو شاید ادھر ہی ہو کر بغداد شریف کی زیارت بھی کر آؤں کربلائے معلیٰ اور نجف اشرف اور کاظمین شریفین کی عتبات عالیات کی زیارت کا بھی شرف مل جائے اور ایران اور عراق ہوتا ہوا کراچی پہنچ جاؤں۔

سفیر صاحب ایران سے مل کر جب لوٹا تو اترسوں اور پرسوں کی مایوسی کے بعد کہ ٹیلیفون پر ٹیلیفون کیا اور رانتخار کی دوکان "ہندوستان" کی منتظمہ پولش لیڈی صاحبہ کی طرف سے جواب نہ ملا پھر ایک بار قسمت آزمائی کی اور دو والدام سے ملنے خود گیا۔ پرسوں بھی گیا تھا، مگر دوکان پر کوئی نہ تھا، بند تھی آج بھی ایسا معلوم ہوتا تھا، مگر یوسف نے دروازہ کا ہینڈل گھمایا تو کھل گیا اور اندر جا کر

دیکھا تو تن تنہا و والدام براج ہے رہیں۔ سنتے ہی غریب دیوانہ وار نکل آیا اور پیرس
کے بازار میں ساری خلقت نے یہ تماشا دیکھا کہ ایک دڑھیل بوڑھا عربی عبا اور
ہندوستانی کھدّر پہنے ایک فرانسیسی (بظاہر) جوان کے گالوں کو اور منہ کو بوسے دے
رہا تھا اور وہ جوان اس کی داڑھی کو چوم رہا ہے۔ جب مصافحہ معانقہ اور بوس و
کنار کا سلسلہ ختم ہوا تو انہیں لے کر ہوٹل آیا۔ دوپہر کو سفارت خانہ افغانستان
جا ہی رہا تھا کہ یہاں کے ایک مشہور ترین ڈاکٹر صاحب کا ٹیلیفون آیا کہ بجائے کل
صبح ۸½ بجے کے آج ۴ بجے آؤ۔ ان سے ڈاکٹر دیہی کے ذریعہ سے وقت مقرر کرایا
تھا اور پیشتر اس کے کہ تین ہفتہ کا فاقہ کروں مناسب سمجھا تھا کہ ان کو بھی اپنا حال
سنادوں اور اُن سے بھی مشورہ لے لوں۔ انکا نام PROF MARCEL' L' ABBE
ہے اور یہاں طب کے شعبہ میں جو چار مشہور ڈاکٹر ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہیں، اور
ذیابیطس کے علاج کے ماہر ہیں۔ میں نے عذر کیا کہ مجھے سفارت خانہ میں لنچ کو جانا
ہے کہا دو بجے نہ سہی سوا دو بجے تک آجاؤ۔ مگر چونکہ سفیر صاحب خود سفارت خانہ ۱½
بجے کے قریب تشریف لائے اس لئے ڈھائی بجے سے پیشتر وہاں سے نہ نکل سکا۔ تین
بجے ڈاکٹر صاحب کے ہاں پہنچا اور انہوں نے دوسرے دن شام کے سات بجے وقت
دیا۔ اس سے پیشتر بالکل وقت نہ دے سکے۔ مجبوراً انہی کی وجہ سے آج تک ٹھہرنا پڑا۔
اب پونے دس بجے ہیں۔ ۴½ بجے فجر کی نماز پڑھی (آخری وقت تھا) اور در اصل
۳½ بجے تھے کیونکہ آجکل موسم سرما کا دن ہے۔ گھڑی ایک گھنٹہ زیادہ بجاتی ہے۔ نماز
سے فارغ ہوتے ہی خط لکھنا شروع کیا تھا اور دو چار ملاقاتی آگئے ان سے گفتگو ہوئی۔
ایک ایرانی اخبارات کے نمائندے طباطبائی صاحب اور ان کے ساتھی تھے۔ ایک مختصر
انٹرویو ایرانی اخبارات کے لئے دیا، اور اب اس خط کو ختم کر کے مسٹر گک کے ہاں
جاؤں گا۔ کچھ روپیہ نکلوا کر ہوٹل کے بل ادا کروں گا اور ۱۲ بجکر ۵ منٹ کی ٹرین میں

(حسب دستور ۱۹۲۱ء) لندن جاؤں گا۔ ڈاکٹر کے ہاں سے واپس آکر شریف پاشا کے ہاں گیا۔ ڈاکٹر وہی وہیں تھے اور رشید سعدی بے جن سے روم میں ملاقات ہوئی تھی۔ اور جو انگریزی خوب بولتے تھے وہ بھی ملے۔ کل رات شریف پاشا کے ہاں کھانا بھی ان دونوں کے ساتھ کھایا۔ شریف پاشا کے ہاں سے پرسوں شام کو واپس آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ قاضی عبدالولی خان معہ دو صاحبزادیوں کے جو نہایت حسینہ اور جمیلہ نفیس اور جن میں سے ایک اب مسلمان ہے اور دوسری کو وہ نیم مسلمان اور نیم کافر کہتے ہیں مگر جو شاعروں کی اصطلاح میں دونوں کی دونوں کافر ہیں اور فقہا کی اصطلاح میں عین جنات ہیں تشریف لائے ہیں۔ ایک امریکن ہے دوسری آسٹرین جرمن۔ یہاں سے چلتی گاڑی میں لکھ رہا ہوں ۵ - ۱۲ پر چل کر وکٹوریہ ۳۰ - ۱۹ تک پہنچا دیگی مگر ہندوستان کی گاڑی نہیں ہے۔ فرانس کی گاڑی ہے جس میں انقلابی حرکت اب زوروں پر نہیں ہے۔ دونوں تعلیم بھی پا رہی ہیں اور آرٹ بھی سیکھتی ہیں۔ جرمن نے کل شام کو کوئی گھنٹہ بھر میں کوئلہ یعنی چاک سے میری تصویر بھی کھینچ کر عنایت فرمائی ہے۔

خیر یہ تو ہؤا مگر رات کو وہی والدام اور امریکہ کے لکھ پتی نے میرے ساتھ ہوٹل میں کھانا کھایا۔ یوسف گھر گئے تھے۔ شوکت کا تار آیا تھا کہ آ رہے ہیں مگر ان کے گھر کی مالکہ یا خادمہ انگریزی میں تار ہونے کے باعث صحیح طور سے نہ سمجھ سکیں کہ کس وقت سوار ہوں گے اور کس وقت پہنچیں گے۔ کھانا ختم نہ ہؤا تھا کہ وہ آگئے اور جیسا میں نے قیاس کیا تھا وہ بھی اسی گاڑی میں آ رہے تھے جس میں میں آیا تھا۔ ہم سب نے جا کر ان کا استقبال کیا اور یوسف انہیں اپنے گھر لے گئے۔ میرا خیال ہے کہ اب تک بھی شاید اس بندۂ خدا نے اپنے گھر یعنی بوررلا وین (BOURGLA VEINE) میں کسی کو اپنے آنے کی خبر نہیں کی ہے ان کو چھوڑ کر ہم نے وہسکی کو ان کے ہوٹل کے قریب چھوڑا پھر پیرس سے باہر نولی (NEVILLY) میں چونکہ ان کی صحبت سے طبیعت سیر نہ ہوئی تھی

اس لئے پھر وہ مجھے واگراں ہوٹل تک چھوڑنے آئے اور آخری میٹرمیں واپس ہوئے۔
صبح ہوتے ہی عبدالولی خان حسب وعدہ آگئے اور پھر دونوں "بچاپچے" یوسف اور شوکت بھی آگئے اور ہم اپنی آئندہ قیام گاہ دیکھنے کے لئے گئے۔ پہلی رائے فان ٹین بلان FONTAIN BLAN) کی تھی مگر وہ بہت دُور ہے۔ دوسری رائے ہوئی کہ سان کلو یا یوادی بولان پیرس کے قریب یا سان ژرمین (ST GERMAINS) میں کمرے یا پھوس کے بنگلے کی تلاش کریں۔ اسی لئے آخرالذکر کو دیکھنے گئے۔ نہایت عمدہ اور دلفریب جگہ ہے۔ پہاڑی ہے جنگل ہے۔ دریائے سین کا کنارہ ہے مگر اس عمدہ منظر کو دیکھ کر بیوی بچے اور بھائی بہن یاد آگئے اور میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔
جب چلنے لگے تو یاد آیا کہ مہاراجہ ملکر بھی تو یہیں ہیں۔ چنانچہ ان کا پتہ دریافت کرنے کے لئے یوسف کو پاس کے ہوٹل میں بھیجا۔ وہ چند ہی قدم چلے ہونگے اور ہم ٹیکسی والے سے پوچھ ہی رہے تھے کہ ایک راج نے جو پاس کے گھر کی دیوار درست کر رہا تھا اور جس نے غالباً مہاراجہ صاحب کے مکان میں بھی کچھ کام کیا ہوگا بول اٹھا کہ مجھے معلوم ہے۔ اور ٹیکسی والے کو پورا پتہ بتا دیا۔ واقعی نہایت ہی خوبصورت CHATEAU (شاتو) (COUNTRY HOUSE) (شہر کے باہر والا مکان خریدا ہے)۔ ہمیں معلوم نہ تھا کہ مہاراجہ بھی یہیں ہیں۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ نئی مہارانی کے وطن امریکہ تشریف لے گئے اور ہم بے دھڑک اندر چلے گئے۔ دربان کا مکان بند تھا گھنٹی بجائی۔ کوئی نہ بولا۔ تب تو ہم اور بھی بے تکلف ہو کر ٹیکسی لے کر اندر چلے گئے اور مکان کو دیکھا۔ اندر کوئی نہیں معلوم ہوتا تھا ہم دروازہ پر جاکر ہم نے گھنٹی بجائی۔ اب تو اندر سے ایک زبردست کتا دروازہ تک آیا اور تھوڑی دیر بعد ایک ہندوستانی صاحب جو غالباً کپتان بڑودے (ایڈی کانگ) تھے آئے اور دروازہ کھول کر مجھے پہچانا۔ کہ ہونہ ہو علی برادران میں سے ایک دیوانے کھدر پوش ہونگے۔ اب کیا تھا ہم

نے پوچھا کہ رشید ہیں تو معلوم ہوا کہ کل ہی لندن گئے ہیں اور ہمارے آنے کا سنتے ہی یاسنا ید ہم کو اوپر سے آتے دیکھ کر رشید کی لڑکی نے مٹھی بھر الائچیاں بھیجیں اور کہا کہ کیا کروں یہاں پان نہیں ورنہ پان بھیجتی۔ ہم نے شکریہ ادا کیا اور میں نے کہا کہ نہیں کہہ سکتا کہ سلام کہلا بھیجنا زیادہ مناسب اور موزوں ہوگا یا دعا کہلا بھیجنا یا پیار۔ ڈرتے ڈرتے مہاراجہ صاحب کا حال پوچھا تو معلوم ہوا کہ تشریف رکھتے ہیں۔ مگر زکام کے باعث ابھی خوابگاہ سے برآمد نہیں ہوئے تاہم ایڈیکانگ صاحب نے خود ہی فرمایا کہ میں اطلاع کئے دیتا ہوں اور جو ارشاد ہوگا اس سے آپ کو مطلع کر دوں گا۔ بڑی دیر تک انتظار کرنا پڑا ایہاں تک کہ میاں شوکت کہنے لگے کہ میری تو آنتیں قل ھُو اللہ پڑھنے لگیں اور قاضی صاحب نے کہا کہ مجھے ۲ بجے سے پہلے نیم مسلمہ نیم کافرہ کے پاس جانا ہے اگر تم زیادہ رُکے تو مَن" روانہ باشم"۔ اتنے میں ڈاکٹر کوسپادی صاحب آئے اور فرمایا کہ مہاراجہ صاحب کو زکام ہے اس لئے میں نے آج دیر میں خوابگاہ سے نکلنے کا مشورہ دیا ہے۔ لیکن اب وقت ہوگیا ہے اور مہاراجہ صاحب نیچے تشریف لا رہے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے پوچھا کہ چائے پیجئے گا۔ تو "بچا چیچ" تکلف کرنے لگے۔ میرے بہنوئی۔ میرے خسر۔ میرے سمدھی اور اب میرے سالے بھی نمکخوار ریاست رہ چکے ہیں اس لئے میں نے کہا کہ میں تو نہیں پیوں گا (حالانکہ لڑکے کہنے لگے تھے کہ صرف آپ ہی لیجئے) البتہ یہ بچے بہت بھوکے ہیں چنانچہ باوجود ان کے جھوٹے انکار کے ہم سب کھانے کے کمرے میں گئے اور ایک بچہ نے اور قاضی صاحب نے چائے پی۔ ابھی یہ شغل جاری تھا کہ مہاراجہ صاحب نیچے تشریف لے آئے۔ اور مجھے بلایا۔ مہاراج کی صحت بھی خراب ہے دل کی بیماری ہے مگر (ORGANiC) نہیں ہے۔ ڈیڑھ مہینہ بعد سوئٹزرلینڈ جائیں گے۔ سان زریمن سے واپس آکر ہم سب نے کھانا کھایا۔ اور اس کے بعد مس میریا ہینیش (Miss MARiA HEINiSH) نے

میری تصویر کھینچی۔ یہاں کے ہندوستانی تاجر موتی مسٹر رانا جن غریب کو مدت ہیں دوران جنگ میں سان مارٹننک (ST. MARTINIQUE) میں فرانسیسی حکومت نے نظر بند کر رکھا تھا اور جن سے میں وٹھل بھائی پٹیل صدر اسمبلی کے ساتھ ایک رات کو ملنے گیا تھا اور جو پرسوں بھی تشریف لائے تھے اور کل بھی تشریف لائے اور دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے ان کے ساتھ ڈاکٹر وہیں کے ساتھ مارسل لابی ڈاکٹر کے پاس گیا۔ خوب دیکھا بھالا مگر تین ہفتہ کے فاقہ کو پسند نہیں کیا گیا۔ گو اعتراف کیا کہ کبھی ہمیشہ کے لئے اس سے مرض کی جڑ بھی کٹ جاتی ہے مگر ان کا بھی انصاری کی طرح یہی خیال ہے کہ مرض باقی رہتا ہے۔ اور پھر پرہیز علاج جاری رکھنا پڑتا ہے اور فاقے کے باعث کمزوری کا بھی اندیشہ ہے۔ تاہم کوئی خطرہ اس میں نہیں بتایا بشرطیکہ ڈاکٹر احتیاط برتتا رہے۔ خود ایک غذا نامہ بھی تیار کر دیا اور دو نسخے بھی لکھ دیئے اور پیشاب کا خاص امتحان کیا اور ایویان (EVIAN) میں جہاں کا پانی ہم لوگ ہوٹل ریجینا HOTEL REGINA میں پیا کرتے تھے جا کر ایک ڈاکٹر کے ہاتھ کے نیچے علاج کرانے کی بھی ہدایت کر دی۔

یہ تمام داستان ہے میرے آٹھ سال بعد پیرس آنے اور ہوٹل واگراں میں ٹھہرنے کی۔ تم بہت یاد آتے ہو۔ خدا کرے کہ تمہارے آقائے ولی نعمت تمہیں ضرور ہمراہ لائیں۔ جتنا آرام تمہاری ذات سے انہیں پہونچیگا اور انہیں ہرگز نہ پہنچا سکے گا۔ خدا کرے ہمارے دیگر احباب بھی آئیں۔ رات کو شریف پاشا کے ہاں کھانے کے بعد دیر تک کانِ اسلام اور تنظیم مسلمانان اور اس کے لئے ایک نئے ٹائپ کے علماء پیدا کرنے اور تاسیس خلافت کے منہاج خلافت راشدہ پر گفتگو ہوتی رہی۔ کل اس قدر تھک گیا تھا کہ عشاء کی نماز بھی رہ گئی۔ بستر میں داخل ہوئے بغیر ہی اخبار پڑھتا پڑھتا بلغ کے بچہ کے پر کی رضائی پر پڑا پڑا سو گیا۔ مگر الحمد للہ ۴½ بجے صبح کے یعنی در اصل ۳½ بجے اٹھ بیٹھا۔ اور نماز فجر اس بار یورپ میں پہلی بار نصیب ہو گئی۔ "بجا ہے چیچ" اور وہ والدام ٹامس گگ

کا نوکر اور قاضی آ گئے اور سامان بندھوایا گیا اور سب سے آخر میں (حسب دستور سابق)
ٹامس کُک کے ہاں جا کر بیس پونڈ نکلوائے تا کہ ہوٹل کے بل کے پندرہ پونڈ ادا کئے جائیں۔
اور "انعام" بالجبر "بخشا" جائے اور لندن کے لئے کچھ روپیہ رکھ لیا جائے شوکت اللہ کو
یونہی ساتھ لے لیا اور احتیاطاً کہہ دیا تم جا کر دیکھ لو کسی کا خط کا ہے کو آیا ہوگا، مگر ممکن
ہے مہاراجہ الور نے میرے مبارکباد کے تار کا جو ۲۶ کو عین ان کی سالگرہ کے دن اسلئے
سے روانہ کر دیا تھا جواب آیا ہو۔ معلوم ہوا کہ دو خط لندن سے آئے ہیں وہ تو شوکت
لے آیا مگر ایک تار بھی ہے جس کے لئے رسید پر مجھے خود دستخط کرنا ہوں گے چنانچہ اوپر
گیا اور نہایت اطمینان کے ساتھ دستخط کئے مگر بجائے ایک تار کے دو تار ملے۔ ایک
شوکت عمر کا تھا جس کا اور اشرف کا خط بھی آیا تھا۔ ایک کو کھولا تو اس میں بھیجنے والے
کا نام شوکت ہی تھا مگر بمبئی کا چلا ہوا تھا اور آخری لفظ COURAGE نظر آیا۔ جب
پڑھا تو پہلے الفاظ تھے SISTER DEAD۔ آنکھوں کے تلے اندھیرا
چھا گیا اور سکتہ کا عالم سا ہو گیا۔ شوکت اللہ کو دکھایا اور دوسری بار پھر پڑھا اور چپ
کھڑا کا کھڑا رہ گیا، مگر بحمد للہ پھر خدا یاد آیا اور انا للہ و انا الیہ راجعون۔ بار
بار پڑھا اور ہوٹل روانہ ہوا۔ سب کھڑے تھے۔ وہبی بھی آ گئے تھے پہلے انہیں سے
ملاقات ہوئی اور تار کا ان سے ذکر کیا، پھر بل ادا کی۔ اور ایک بہتّر فرانک کی بل پر جس
کی کہ شراب پی تھی اور جو اسی رات لنڈھائی گئی تھی جس رات کو میں پیرس ساڑھے
دس بجے پہنچا تھا منیجر سے تکرار کی۔ رات ہی ڈنر پر شریف پاشا کے ہاں نہاد رشاد[1] کے نام کے
تار کے اس فقرے پر کہ *Can not give haram wine*
(حرام شراب نہیں دے سکتا) خوب ہنسی اڑ رہی تھی۔ وہ کہہ رہے تھے کہ میں خوب آج

---

[1] آپ ترک ہیں ۱۹۲۰ء میں وفد خلافت کے ساتھ پیرس میں کام کرتے تھے۔

سب کو شمپین وغیرہ پلاؤں گا۔ پھر جب خود کھانے پر دوا پی۔ تو کہنے لگے کہ اسے حرام شراب نہ سمجھنا BACTRIA ہیں جو بطور دوا کے پی رہا ہوں۔ تمہیں یاد ہوگا کہ ایک مد (ITEM) یہ بھینا ہوٹل میں سے اس قسم کا بل میں پہلے ہی بار آگیا تھا اور کٹوایا گیا تھا۔ اس بار شریک پنجاب کے ایک بزرگ کی عنایت سے جو اسٹیشن پر ملے تھے اور خود ہی ساتھ ہو گئے تھے اور جب میں نے ہوٹل پہنچتے ہی وسکی ORANGEADE (افشردہ نارنج) منگوایا تھا تو ان ذات شریف نے ہوٹل کے خدمتگار کے کان میں کچھ کہا تھا چونکہ منہ میں پہلے ہی بُو آ رہی تھی میں سمجھ گیا تھا کہ کیا کہا ہوگا اور جب وسکی آئی اور معذرت کی اور کہا کہ میں اپنے والد بزرگوار کے سامنے بھی پیتا ہوں، دوسروں کی طرح ریاکار نہیں ہوں۔ اور پھر کہا کہ دونوں چیزوں کی قیمت میں خود ادا کر دوں گا۔ میں نے کہا نہیں میں اپنا خرچ دوسروں پر نہیں ڈال سکتا میں افشردہ نارنج کی قیمت خود ادا کر دوں گا تو فرمایا کہ مگر اس کی (وسکی) کی طرف اشارہ کر کے) قیمت تو آپ نہیں دیں گے۔ جس کا میں نے اعتراف کیا۔ بڑی مشکل سے میں نے ان ذات شریف کو پونے بارہ بجے رخصت کیا۔ پھر وضو کر کے نماز ادا کی اور سونے لیٹا۔ ساڑھے بارہ کے بھی بعد دروازہ کسی نے کھٹکھٹایا۔ میں اندر سے بند کر چکا تھا اس لئے ENTREE (اندر نہ آؤ) کا تختہ تھا۔ خود جا کر دروازہ کھولنا پڑا۔ کھول کر دیکھتا ہوں تو یہی ذات شریف کھڑے ہیں اور ہوٹل کا پورٹر (PORTER) کہہ رہا ہے کہ دو پونڈ کے عوض مجھ سے دو سو بیس فرانک انہوں نے مانگے اور نیچے دو انگریزوں کے ساتھ شراب پی اب پونڈ نہیں دیتے۔ ان سے پوچھا گیا تو کہتے ہیں چور تھے جواب دینا اور بھی مشکل ہو گیا۔ سب کا قیاس ہے کہ ان کے مانگنے پر اس شخص نے انہیں وسکی پلائی ہوگی اور یہ مفت کی پی لینے کے بعد فاقہ مستی رنگ لا رہی تھی۔ میں نے کہا۔ میں نہیں جانتا۔ یہ

شخص میرا دوست نہیں اور نہ اِسے میں پہچانتا ہوں - یہ کہتا ہے کہ میں ہوٹل ہوس
امان لوورار (HAUSMAN LOUDRA) میں رہتا ہوں - غالباً
بولیوارد ہوس امان (BOULEVORDE HAUSMAN) میں ہوٹل لودرے
(HOTEL LOUDRE) ہے - اسے وہاں پہنچا دو اور دام وصول کرلو -
پورٹر نے کہا یہ تو کہتے ہیں کہ میں اسی ہوٹل میں آج رات کو سوؤنگا - میں نے کہا
کہ یہ جھوٹ ہے بہر حال مجھ سے کوئی واسطہ نہیں تم جانو اور یہ جانیں - اس کے
بعد دروازہ بند کرکے میں پھر سو گیا - صبح کو پورٹر سے معلوم ہوا کہ وہاں نہیں
رہتے پھر انہوں نے کہا کہ (CAFE DELA PiA) کافے
ولا پے چلو - وہاں جاکر اسے تو دروازہ پہ چھوڑا اور خود دوسرے دروازے
سے نکل کر رفو چکر ہو گئے - یہ شخص جوان طالب علم کی طرح ہے، انگلستان رہ چکا
ہے، بہت خراب انگریزی بولتا ہے اور ذرا ذرا فرانسیسی بھی - اور کہتا ہے کہ روس
بھی جا چکا ہے اور جرمنی بھی - نام غالباً غلام احمد بتلایا تھا اور کہتا تھا کہ غلام صادق
صاحب میرے عزیز ہیں واللہ اعلم بالصواب - بہر حال، معلوم نہیں کہ پورٹر کی کہانی
کی کیا اصلیت ہے - مگر میں بھی ۲۷ فرانک کی شراب کے دام ادا کرنے کا گنہگار ہو
چکا ہوں - اب کیلئے قریب آ گیا - رخصت ہوتا ہوں - یہ خط بیگم صاحبہ کو بھیجے دیتا
ہوں اِس لئے کہ ان کو نہیں لکھ سکا - جعفری بھی دیکھ لے گا اور پھر تمہیں بھجوا
دیگا - تمہارے ملٹری ممبر صاحب کی میم صاحبہ جہاز ہی پر تھیں مگر نام کے متعلق کچھ
غلط فہمی ہو گئی تھی کئی روز میرے پاس ہی بیٹھے رہے اور ایک بریگیڈیر صاحب
کے ساتھ گفتگو کرتے رہنے کے بعد خود ہی مجھ سے خطاب کرکے بتلایا کہ وہ کون
ہیں اور کہاں سے آ رہے ہیں اور تم لوگ انہیں سٹیشن تک رخصت کرنے آئے
تھے - اس کے بعد بھی دو چار بار تمہارے شہر کے متعلق تھوڑی دیر گفتگو

رہی۔ بریگیڈیر صاحب ہم سے بہت شرافت کے ساتھ ملتے رہے اور ان سے
خوب کھل کھل کر باتیں ہوا کیں، مگر ان سے ہماری زیادہ باتیں نہیں ہوئیں۔
بریگیڈیر صاحب سے البتہ ان کی خوب باتیں ہوتی رہیں۔ غالباً ان کے شوہر
کے دوست ہوں گے۔ اچھا اب کیلئے آگیا۔

رخصت

تمہارا محمد علی

(۹)

وُرودِ لندن

اب میری داستان سُنو۔ حیات والا خط (جو تم کو اس لئے بھیجا تھا کہ اس وقت تک کے تمام حالات سے مطلع ہو جاؤ) تمہیں ملا ہوگا اور کیلے (ساحل فرانس) تک کے سفر کے حالات سے مفصّل اطلاع تم کو مل گئی ہوگی۔ یہاں ۱۲ کو رات کے آٹھ بجے ، در اصل ، ۷ بجے شام کے جبکہ یہاں عصر کا وقت اچھی طرح باقی تھا) وکٹوریہ اسٹیشن پہنچا۔ حیات کا سالا حمید موٹر لئے موجود تھا۔ حیات کے چچا اور سُسر بھی آئے ہوئے ہیں گو اس وقت چند دن کیلئے وہ جنیوا اور پیرس گئے ہوئے ہیں حیات کی سالی نادرہ معہ بچہ کے یہاں ہی ہے۔ رچمنڈ میں نہایت خوبصورت چار پانچ کمروں والا اپنا بنا ہوا مختصر سا مکان خرید لیا ہے اور قیمت صرف یہ ہے کہ چھ گنی کرایہ ہر مہینہ ادا کردیا کرے (یعنی کل اسی روپیہ ماہوار) چند برسوں میں وہ مکان خود اس کا ہو جائے گا۔ سامان نقد خرید لیا ہے۔ اور حقیقتاً وہ بھی ماہواری کرایہ پر اسی طرح مل سکتا ہے (اس کو دیکھ کر تو میں اور بھی بیتاب ہوگیا۔ علی جان والوں کے مکان کا کرایہ اس سے کچھ ہی کم ہے اور مکان ہمیشہ ان کا رہیگا۔ تم آجاؤ تو کھانے اور نوکر کا خرچ بھی ہم سب کے لئے معہ شاکر اور طارق کے، اگر طارق کو ان کے بھائی چھوڑ دیں، تیس گنی یعنی چار سو روپیہ ماہوار سے زیادہ نہ ہوگا۔ بہت ہوا تو پانچسو روپیہ ماہوار ہوگا۔ اور باقی اوپر کے لئے میرے پاس کافی بچ رہیگا۔ حمید کے علاوہ عبد الرحمٰن اور شعیب کے دوست حیدر تھے جن کو راستہ سے میں نے خط بھی لکھ دیا تھا اور تار بھی دیدیا تھا ظفر عمر نے مجھے دہلی لکھ بھیجا تھا کہ ان کا

لڑکا شوکت عمر (دوسرے بھائی کا نام محمدؐ عمر ہے اور یہ دونوں نام سعید محمد خان کے لڑکے شوکت محمدؐ خان اور حسن محمد حیات کے بچہ شوکت محمد حیات کی طرح ہم دونوں بھائیوں ہی کے نام پر رکھے گئے ہیں) یہاں پڑھتا ہے، اس کو لکھ دینا تو ضرور تم سے ملے گا۔ مَیں نے خیال کیا کہ اس لڑکے کو کیوں نہ لکھ دوں کہ میرے لئے مکان کی تلاش کرے۔ چنانچہ اسی وقت دہلی سے خط لکھ دیا تھا، جہاز پر سے پھر لکھا۔ پیرس سے چلتے وقت اس کے اور جامعہ کے میرے پُرانے شاگرد اشرف کے خط ملے اور ایک تار ملا کہ آپ کے جہاز کے خط کے مطابق اِسی محلہ میں کمرے تلاش کر لئے گئے ہیں جہاں آپ کا ڈاکٹر مطب کرتا ہے۔ وہ کمرے بیحد گراں تھے۔ سب سے سستے کمروں کا کرایہ کوئی ۷ گنی (۱۰۰ روپیہ سے کچھ کم) فی ہفتہ (یعنی نادرہ بی کے مکان کے کرایہ سے بھی ان کمروں کا کرایہ پانچ گنے سے زیادہ ہے) انہوں نے لکھا کہ آپ ہمارے پاس ہی کیوں نہیں رہتے؟ بہرحال دونوں اسٹیشن پر موجود تھے اور سب کی رائے یہ ہوئی کہ آج رات کو وہیں قیام کیا جائے۔ پھر ڈاکٹر سے کل دوپہر کو مل کر پوچھ لینا اگر وہ کہے کہ ۱۲ دن کے فاقے میں تم اس قدر کمزور ہو جاؤ گے کہ تم سے یہاں تک نہ آیا جائیگا، تو اس کے قریب کمرے لے لینا۔ خیر انہی کے ساتھ ان کے گھر حمید کے موٹر میں گیا۔ (حمید کا امتحان جلد ختم ہونے والا ہے پھر وہی اپنی موٹر میں ہر طرف گھمانے لیجایا کریگا)۔ رات کو ہندوستانی کھانا کھانے ایک ہندوستانی کی دوکان ہیں گئے۔ اور جھینگے اور مرغی اور ماش کی دال اور پراٹھے خوب اُڑے (مگر چار آدمیوں کا ایک وقت ہی کھانا تیرہ روپیہ میں کھایا گیا)۔ یہ مکان بہت اچھا ہے۔ ایک بڑے کمرہ میں جو حمید کے کمرہ کے برابر ہے، میں سوتا ہوں۔ اس سے ذرا بڑے کمرے میں یہ دو نو لڑکے سوتے ہیں اور وہیں لکھا پڑھا کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ بڑا وسیع کمرہ ہمارے بڑے کمروں کی برابر کھانا کھانے کا ہے۔ اور خوب سجا ہوا وسیع کمرہ ملاقات

کے لئے ہے۔ مکان کے مالک ایک ادھیڑ عمر کے آدمی ہیں اور یہی عمران کی بیوی کی ہے ان کی بیوی ایک قریب کی عزیز ہے۔ ادھیڑ عمر کی عورت گھر کا تمام انتظام کرتی ہے۔ مالک مکان کے بوڑھے والد ایک مگر مستعد کارگذار آدمی جو اپنی روٹی خود کماتے ہیں اساتھ ہی رہتے ہیں۔ بچے یا جوان اولاد بالکل نہیں۔ دو مامائیں ہیں۔ آج کل ایک گئی ہوئی ہے اور ایک آدھی عقل کا آدمی کام میں مدد دیتا ہے۔ میں کمروں کا کرایہ دیا کروں گا اور جو کچھ کھانے میں خرچ ہوگا وہ ادا کیا کروں گا۔ پہلے ہفتہ کی بل آئے گی تو معلوم ہوگا کہ کتنا خرچ ہوا کرے گا۔

یہ لڑکے معہ کھانے کے دو دو گنی فی ہفتہ دیا کرتے ہیں۔ میرا خرچ فی ہفتہ ساڑھے تین گنی ہو جایا کرے گا (یعنی کوئی دو سو روپیہ ماہوار) وجہ یہ ہے کہ ڈاکٹر نے حکم دیا ہے کہ ابھی صرف دو وقت کھانا کھایا کروں اس لئے ایک بجے کے قریب تین چار ناشپاتیاں نرم، کوئی پاؤ بھر اسٹرابیری (بالائی کے ساتھ) کچھ چیری جو بیروں کی طرح ہوتی ہے) اور ایک دو نارنگیاں کھا لیتا ہوں۔ شام کو ۷ بجے تھوڑا سا گوشت اور بہت سی ترکاریاں اور سلاد (کچا کا ہو) کھانے کو ملتا ہے۔ اجازت ہے کہ اگر جی چاہے تو صبح اور سہ پہر کو کافی (قہوہ) بالائی کے ساتھ پی لوں، یا بہت ہی ہلکی چائے۔ روٹی کھانے کی اجازت نہیں ہے لیکن آئندہ تھوڑی سی کی روٹی بھی تھوڑی سی ملا کریگی۔ لطف یہ ہے کہ شکر کی مطلق اجازت نہیں ہے مگر شہد کی اجازت ہے۔ اس لئے قہوہ اور چائے میں شہد ڈال سکتا ہوں، مگر پھلوں کے ساتھ گوشت نہیں اور گوشت کے ساتھ پھل نہیں کھائے جا سکتے۔ کھانے کے ساتھ پانی کی اجازت نہیں ہے البتہ دو کھانوں کے درمیان پانی پی سکتا ہوں۔ اس ڈاکٹر کا خیال ہے کہ کھانے کی چیزیں غلط طور پر ملائی جاتی ہیں۔ اس لئے ہاضمہ میں خرابی ہوتی ہے۔ دوسرے قدرتی چیزیں اللہ

کی بنی ہوئی کم کھائی جاتی ہیں۔ انسان کی بنائی ہوئی چیزیں زیادہ کھائی جاتی ہیں
جن سے ہاضمہ خراب ہوتا ہے اور امراض پیدا ہوتے رہتے ہیں اور علاج بھی مشکل
ہو جاتا ہے وہ کہتا ہے کہ شہد کھاؤ۔ خدا نے بنایا ہے۔ شکر مت کھاؤ اسے انسان
نے خراب کر دیا ہے۔ گنا کھاؤ تو مضائقہ نہیں۔ روٹی انسان کی بنائی ہوئی
ہے اگر کھاویں تو کم اور بھوسی سمیت۔ زیادہ گوشت اچھا نہیں۔ ترکاریاں اچھی
ہیں لیکن سلاد (جو کچا کا ہوتا ہے) بہتر ہے دوا کا وہ بالکل قائل نہیں۔ شکر
کی گولیاں (یعنی سکرین کی) بھی ممنوع۔ دوا کی جگہ وہ ورزش کراتا ہے لیکن
ابھی تک ورزش میں دو طریقہ سے ناک سے لمبے لمبے سانس لینا اور منہ سے
سیٹی بجانے کی طرح سانس نکالنا بتایا ہے۔ بیٹھنے اور کھڑے ہوتے اور چلنے
کا بھی طریقہ بتایا ہے۔ رہا ۲۱ دن کا مسلسل فاقہ تو تم یہ سنکر خوش ہو گی کہ
وہ میرے لئے تجویز نہیں کیا جائیگا، بلکہ کئی بار دو، دو، تین تین دن کے فاقے
کر دیئے جائیں گے۔ کل سہ پہر کو ان کے پاس مزید ہدایات لینے جاؤں گا۔ اب
تک دو ڈھائی ملاقاتیں ہوئی ہیں۔ قارورہ کا امتحان ہر ہفتہ ہوا کرے گا۔
گذشتہ ہفتہ کے امتحان میں ۳ فیصدی شکر تھی اور ½ فیصدی چربی ایسی ٹون
(ACETONE) زہر بھی ضرور کچھ نہ کچھ ہوگا مگر کیمیاوی تجزیہ کرنیوالے
نے اپنی رپورٹ میں ذکر نہیں کیا تھا۔ یقین ہے کہ اس ہفتہ شکر کم ہو گی۔
پیشاب صرف رات کو آتا ہے مگر اب رات کو صرف ایک بار کوئی دو ڈھائی
بجے کے قریب اٹھنا پڑتا ہے اور پھر علی الصباح کوئی چھ بجے اور پھر ایک آدھ
بار اور رات کو اکثر بارہ بجے کے بعد سونا ملتا ہے۔ یہاں گرمیوں میں گھڑی
ایک گھنٹہ آگے کر دی جاتی ہے اس لئے یہاں کے آٹھ بجے حقیقتاً وقت ۷
بجے ہوتا ہے۔ یہاں کے حساب سے سورج سوا نو بجے غروب ہوا کرتا ہے اور

پونے پانچ بجے نکلا کرتا ہے۔ نماز فجر تو صرف ایک دن مل سکی ہے اور اس کے بعد میں پھر گھنٹہ بھر کے لئے سو گیا۔ نماز عشاء کا وقت ہوتا ہے، اور حقیقت تو یہ ہے کہ اس وقت بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شفق پھوٹی ہوئی ہے۔ اب ایسا کیا کروں گا کہ دوپہر کو ایک گھنٹہ سو لیا کروں گا تاکہ عشاء اور فجر دونوں اچھی طرح مل جایا کریں۔

کل مسٹر ٹامس کک کے یہاں گیا تھا تاکہ خطوں کے ساتھ ہی اخبار بھی آجایا کرے۔ وہاں امیر احمد کا لڑکا عزیز بھی مل گیا۔ قریب ہی کی بڑی موٹروں کی دوکان والے کے ہاں ...... میں کام کرتا ہے، چلتے وقت پوچھنے لگا کہ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو فرمایئے۔ میں نے کہا کہ بس یہی خدمت کر سکتے ہو کہ موٹروں پر چڑھائے رکھو! بہن کو یہ میرٹھ میں (بیگم صاحبہ نواب اسمٰعیل خان کو) اطلاع[۱] دیدینا کہ ان کے بھائی صاحب واحد محمود آجکل خوب محنت کر رہے ہیں۔ مجھے ہمراہ لے جا کر چائے پلائی ؎

---

[۱] بیگم صاحبہ محترمہ کے نام خط

(۱۰)

بیگم صاحبہ کو لندن آنے کی دعوت

۲۸ جون ۲۸ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیاری زہرہ[1]

خدا تمہیں زاہد کو اور طارق کو اپنے حفظ و امان میں رکھے اور پروان چڑھائے
میں نے بی کو خوب مفصل خط لکھ دیا ہے۔ اس سے سب حالات تمہیں معلوم
ہو جائیں گے۔ اگر وہ جلد دہلی سے بی نہ بھیجیں تو لکھ کر منگا لینا۔ میں نے اُن
کو لکھ دیا ہے کہ تمہارے چچا کو وہ خط (یعنی اس کے دو ضروری ورق) بھیج
دیں۔ میں چاہتا رہوں) کہ مظفر کے ہمراہ وہ اور بچیاں چلی آئیں اور اگر تم
اور زاہد چھوڑ سکو تو طارق صاحب بھی چلے آئیں۔ مظفر انشاءاللہ عنقریب
ڈاکٹری کی تعلیم کے لئے آجائیں گے۔ طارق صاحب کو میں نے علیحدہ خط
لکھا ہے وہ ضرور ان کو خود پڑھوا دینا۔ اسی طرح لکھنا پڑھنا آجائے گا۔
میں پہلے سے بہت اچھا ہوں مگر تنہائی میں طبیعت سخت گھبراتی ہے۔ اچھا
اب رخصت ہوتا ہوں۔ اس لئے کہ ڈاک جا رہی ہے عرفان صاحب سے
کہہ دینا کہ انشاءاللہ اگلے ہفتہ ان کے نام مفصل خط لکھوں گا جسے وہ
جعفری[2] اور تمہاری بی کے پاس بھی ضرور بھیج دیں۔ اب تمہیں خدا کے سپرد کیا۔
زاہد کو اور چچا کو اور سب کو خوش رکھو۔ خدا تمہارا بھلا کرے۔

تمہارا پیارا باپ   محمد علی

---

[1] مولانا مرحوم کی بڑی صاحبزادی [2] سید محمد صاحب ایڈیٹر ملت دہلی۔ اس وقت موصوف ہمدرد کے ایڈیٹر تھے۔

افسردگی و بے چینی

پیارے عرفان۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

تمہارا محبت نامہ مورخہ ۱۵ جون ملا۔ اگر تمہیں میری اس مفارقت کا بے انتہا افسوس ہے تو یقین جانو کہ مجھے کچھ اس سے زیادہ ہی افسوس اور صدمہ ہے۔ جب ۱۹۵۱ء میں ہندوستان کو چھوڑ کر ایک نوجوان ناتجربہ کار طالب علم کی حیثیت سے انگلستان آیا تھا اور اس "مہذب" اور "متمدّن" ملک کی دلفریبیوں کا بظاہر شکار ہو رہا تھا تو میرے بڑے بھائی ذوالفقار علی خان صاحب گوہر نے مجھے لکھا تھا کہ بھلا اس ملک میں ہم ہندوستان والے تمہیں کیا یاد آتے ہوں گے۔ ان کے جواب میں میں نے انہیں اپنی طالب علمی کے زمانہ کا ایک شعر لکھ بھیجا تھا وہی اب تمہیں لکھتا ہوں ؎

کسک باقی ہے اب تک گو تیری محفل میں بیٹھا ہے
کہ رہ رہ کر خیال آتا ہے جوہر کو بیاباں کا

اس وقت تو انگلستان پہلی ہی بار ہزاروں آرزوؤں اور تمناؤں کے بعد آنا ہوا تھا، مگر اب تو یہ حالت ہے کہ ؏

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

اور صحیح معنوں میں آرزوئیں اسی طرح خاک ہوتی ہیں کہ دل میں کوئی آرزو ہی باقی نہ رہے۔ سب کی سب نکل آئیں اور ایک کے نکلنے سے بھی دل کو تسلی نہ ہو۔ یہاں دلفریبی کے یعنی دل کو فریب دینے کے ہزاروں سامان ہیں،

لیکن دل کی تسلی کا سارا سامان ہندوستان اور مشرق میں ہے۔ میرے ساتھ جو دو نوجوان طالب علم ہیں، ان پر ہم افسردہ خاطروں کا کچھ نہ کچھ اثر پڑ گیا ہے ع

افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را

لیکن اگر کسی نوجوان کو یہاں کی دلفریبیوں کا شکار دیکھتا بھی ہوں تو بے ساختہ کہہ اٹھتا ہوں ؎

چو می بینم کسے کز کوئے تو دلشاد می آید
فریبے کز تو اوّل خوردہ بودم یاد می آید

رہا میرے ہمعصروں اور ہم ملتوں اور ہم وطنوں کا اس مفارقت پر اظہار خیال، خدا کرے انہیں بھی یہ مفارقت شاق گذرے۔ اب تک تو بظاہر مجھی کو شاق گذر رہی ہے اسد اللہ در من قال ؎

وائے اس شخص کی قسمت جو تجھے یاد کرے
ہائے اس شخص کی قسمت جو تجھے یاد رہے

برادرم! ابھی میری قسمت پر آنسو ہی گراتے رہو کہ میں ہندوستان کو اور مسلمانوں کو ہر وقت یاد کرتا رہتا ہوں۔ ابھی میری قسمت پر رشک نہ کرو کہ کبھی ہندوستان والے اور مسلمان بھی مجھے یاد کر لیا کرتے ہیں۔ میں یہاں ایک گوشۂ تنہائی میں پڑا ہوں، حالانکہ لوگ اسے گوشہ تنہائی نہ کہیں گے اس لئے کہ ومبلڈن (WIMBLEDON) میں جا کر ٹلڈین (TILDEN) لاکوسٹ (LACOSTE) کوشے (GOCHET) بوروترا (BOROTRA) ہنٹر (HUNTER) پیٹرسن (PATTERSON) ہاکس (HAWKES) کوئین (COEN) ہیلن ولس (HELANWILLS) ڈی الویرز (DE ALVAREZ) سلی آسن (CILY AUSSEN) بیٹی

نٹل (BETTY NUTHAL) کی لان ٹینس (LAWN TENNIS)
دیکھی۔ ہینڈن جاکر فوجی طیاروں کے کرتب دیکھے۔ لارڈس (LORDS)
کے کرکٹ کے میدان میں جاکر آکسفرڈ اور کیمبرج کا مقابلہ دیکھا۔ نیو گیلری سینما
(NEW GALLERY CINEMA) ریجنٹ اسٹریٹ (REGENT STREET)
میں جاکر بیری مور (BARRY MORE) کو نامی ناٹک TEMPEST میں
ایکٹ کرتے ہوئے دیکھا اور جارج برنارڈ شا GEORGE BERNARD SHAW
کو اسی سینما میں جاکر دیکھا ہی نہیں بلکہ سُنا بھی۔ اس لئے کہ مووی ٹون (MOVI-
E-TONE.) میں نہ صرف تصاویر نظر آتی ہیں بلکہ آواز بھی صاف سُنائی
دیتی ہے۔ اور ہو بہو نہ کہ گراموفون کی طرح بگڑی ہوئی۔ مگر جس شخص کی ساری
عمر ملک وملت کا کام کرتے گذری ہو اُسے ان تماشہ گاہوں میں بھی ہُو کا عالم
نظر آتا ہے۔ غالب نے خوب فرمایا ہے کہ ؎

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

لیکن استاد غالب نے بھی انجمن کو خلوت ظاہر نہیں فرمایا۔ حالانکہ یقیناً
ان پر بھی بارہا یہی کیفیت طاری ہوتی ہوگی کہ کسی کو اپنا ہم خیال نہ پاکر بھری
محفل میں بھی قید تنہائی کا لطف اٹھانا پڑا ہو۔ محض لوگوں کی خواہش تھی کہ میں
یہاں کی سیاسی جماعتوں میں پہلے کی طرح حصہ لوں لیکن مجھے یہاں کی کسی جماعت پر
اعتماد نہیں، اور بحمد للہ ہزاروں ٹھوکریں کھا کر یہ تلخ مگر مفید ترین سبق اب سیکھ گیا ہوں
کہ ہماری نجات خدا کے سوا اگر کسی کے ہاتھ میں ہے تو وہ خود ہم ہیں۔ اوپر خدا، اور نیچے
خود۔ مجھے کسی سے ملنے میں عذر نہیں، اور جو مجھ سے میری رائے پوچھیگا، اس کے سامنے
اظہار خیالات کرنے میں مجھے ذرا تامل نہ ہوگا، مگر اب مجھے کسی کے پاس جاکر اپنے ملک

اور اپنی ملت کا فسانۂ غم دل سُنانا نہیں ہے۔ سکلات والا میراث ۱۹۱۳ء کا دوست ہے۔[1] اس نے پارلیمنٹ میں لنچ اور چائے کے لئے بلایا، میں گیا اور اس کے دوستوں سے ملا جن میں سے اسی کی طرح کمیونسٹ تھے اور کچھ لیبر پارٹی والے تھے، مگر جس طرح میں نے وہی کھانا کھایا جو ڈاکٹر کے حکم کے مطابق تھا، اور ہر وہ چیز چھوڑ دی جو اس کے حکم کے خلاف تھی، اسی طرح ان احباب کے خیالات میں سے بھی اسی حد تک اتفاق کیا، جس حد تک کہ خدائے حکیم کی منشاء اور مرضی کے مطابق تھا، اور اس حد کے آگے اختلاف کیا۔ دارالعوام کے مشہور لب دریائے ٹمیس (TERRACE) یا" شہ نشین" پر ریمزے میکڈانلڈ[2] اور دوسرے لیبر پارٹی کے عمائد، اور اسی طرح اور پارٹیوں کے عمائد نظر آئے جو اپنے احباب کے ساتھ بیٹھے چائے نوش فرما رہے تھے، مگر اب ان میں سے ایک بھی ایسا نظر نہ آیا جس سے مل کر چارہ گری کی کچھ خواہش کرتا، حالانکہ پہلے سفروں میں انہیں کی تلاش اور جستجو رہی تھی، اور ہر وقت اس کی آرزو رہتی تھی کہ کس طرح ان سے ملا جائے، اور انہیں درد دل سنایا جائے۔ ان سے درمان کے لئے کہا جائے۔

یہاں بھی، اب برسیلز کی کانفرنس منعقدہ ۱۹۲۶ء انجمن مخالفین شہنشاہیت (LEAGUE AGAINST IMPEREALISM) کی بنیاد ڈالی گئی اور میں بھی ایک طرف چپ چاپ تقریریں سن رہا تھا جس میں یہاں کی لیبر پارٹی کے (LEFT WING) کے کچھ لوگ بطور نمائندوں کے اپنی ٹریڈ یونین کی شاخوں کی طرف سے آ کر شریک ہوئے تھے اور برطانیہ کی سامراجی پالیسی کے خلاف اظہار خیالات کر رہے

---

[1] موصوف پارسی تھے اور انگلستان میں بس گئے تھے۔ آپ کو انگریزی پارلیمنٹ کا رکن بھی چنا گیا تھا۔ [2] لیبر پارٹی کے لیڈر تھے۔ ایک سے زیادہ بار انگلستان کے وزیر اعظم ہوئے۔ آخر میں اپنی پارٹی سے کٹ کر قدامت پسندوں سے مل گئے تھے۔

تھے۔ سرنیواس[1] آئینگر نے بھی ایک نہایت معقول تقریر کی جس میں سائمن کمیشن کے خلاف اظہار خیال کیا ہے۔ مگر میں اس جلسہ میں خاموش ہی بیٹھا رہا کیونکہ حقیقتاً برطانیہ کی سامراجی پالیسی خود اس ملک والوں کے لئے ایک سم قاتل اور زہر ہلاہل ہے اور اگر یہ لوگ اپنے درد کا درمان چاہیں تو کیا تعجب ہے لیکن ہمارے درد کا درمان ان کے ہاتھ میں نہیں بلکہ خود ہمارے ہی ہاتھ میں ہے اور اس کا علاج بیان نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں میں ملکی اور ملّی علاج کے لئے نہیں آیا ہوں بلکہ اپنے ایک ذاتی مرض کے علاج کے لئے آیا ہوں۔ البتہ جب اکثر نوجوانوں کو خود غرضی، نفس پرستی اور محض معاش کوشی اور معاد فراموشی میں گرفتار دیکھتا ہوں تو خاموش رہنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ ایک بار مجھ سے بہت زور کے ساتھ محض ہندوستانیوں کے ایک جلسہ کے بعد خواہش کی گئی کہ کچھ کہوں تو میں نے یہی کہا کہ اگر ہمارا ملک تباہ ہو رہا ہے اور اس سے بھی زیادہ تباہ ہوگا تو صرف اسی باعث کہ ہم دھواں دھار تقریروں کے عاشق اور پُرزور تحریروں کے گردیدہ ہیں عمل کا جہاں تک تعلق ہے، ہم ایک مفلوج جسم سے بہتر نہیں۔ سُنا ہے کہ باردولی[2] کے لئے چندہ جمع ہو رہا ہے دیکھئے کس قدر بھیجا جاتا ہے۔ میرے نزدیک ہماری حب وطن اور ملّت پروری کا صحیح معیار یہی ہو سکتا ہے۔ بقول ایک بزرگ کے "میاں دل کی محبت ہاتھ سے پہچانی جاتی ہے" ورنہ یہ سب تُخ تُخ و بندان ہے۔ یہاں لوگوں کو سخت تعجب ہوتا ہے کہ میں اسقدر خاموش ہوں اکثر لوگوں کو تو معلوم ہی نہیں کہ میں اب تین ہفتہ سے لندن میں مقیم ہوں۔ اس کے جواب میں میں بھی کہہ دیا کرتا ہوں کہ میری شورا شوری سارے ہندوستان کے لئے ہے۔ یہاں "بے نمکی" ہی موزوں ہے وہاں لوگ میرے ہر وقت چیخنے چلانے سے تنگ تھے۔ یہاں میری خاموشی سے عاجز آگئے

---

[1] کانگرس کے سابق صدر، آپ نے ابھی حال میں انتقال فرمایا ہے ؛

[2] باردولی میں لگان نہ دینے کی تحریک چل رہی تھی ؛

ہیں اگر ہندوستان میں بھی کوئی اب میری خاموشی پر نالاں ہے تو اُسے غالب کا شعر سنا دیجئے۔

زمن بجرم طپیدن کنارہ مے کردی

بیا بقبر من و آرمیدنم بنگر

آپ نے محمد خان[1] "نجدی" کی خرافات کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے ساری حقیقت آشکارا ہو گئی لیکن میں نے جو فاہرہ میں کہا تھا اس میں کوئی چیز کمزوری کی نہ تھی میں نے شوکت صاحب کی کسی ایسی سازش میں شرکت کی قطعی تردید کی تھی، مگر میں کس طرح بلا تمام واقعات کے علم کے کہہ سکتا تھا کہ شوکت صاحب کے کسی خط کے کسی فقرہ کو توڑ مروڑ کر بھی اسے قتل کی سازش نہ بنایا ہوگا ؟ شوکت صاحب سے زیادہ سادہ دل کوئی مسلمان بھی نہ ہوگا۔ ان کو ساری دنیا پر بھروسہ ہے کہ جب خود ان کے دل میں کوئی بات نہیں ہے تو کسی کے دل میں ان پر تھوڑا سا شبہ بھی ہرگز نہ ہوگا اس لئے وہ تحریر و تقریر دونوں میں اجمال واختصار سے کام لیتے ہیں۔ حالانکہ بعض اوقات تصریح و تشریح زیادہ کار آمد ہوتی ہے مگر وہ کہہ سکتے ہیں کہ تمہاری طوالت پسندی کیا کچھ زیادہ کار آمد ثابت ہوتی رہتی ہے جو میں اس میں اپنا وقت ضائع کروں۔ باوجود میری تصریحات و تشریحات کے میرے ہم وطنوں اور میرے ہم مذہبوں تک میرے متعلق اتنی غلط فہمیاں پھیلائی ہیں کہ توبہ ہی بھلی۔ مگر آپ روائٹر کے تار کو طول طویل بتاتے ہیں حالانکہ جو اخبارات شوکت صاحب نے روانہ کئے ہیں ان میں تو وہ تار نہایت ہی مختصر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے روائٹر کے کسی نمائندے سے کوئی گفتگو نہیں کی۔

---

[1] آپ ہیں تو ہندوستانی لیکن اُس وقت سعودی حکومت میں ایک ممتاز عہدے پر تھے۔ ان کی طرف سے ہندوستان کے اخبارات میں ایک تار چھپا تھا جس میں مولانا شوکت علی مرحوم پر الزام لگایا گیا تھا کہ انہوں نے ایک گمنام یمنی کو سلطان ابن سعود کے قتل کرنے کے لئے مکہ معظمہ بھیجا ۔

نہ کسی سے ملا۔ البتہ جونہی میں عبدالحمید سعید کے دولتکدہ پر پہنچا، مکہ معظمہ کے "مؤتمر عالم اسلام" کے دوست علی حسن صاحب "الاخبار" کے نمائندے میرے پاس آئے اور مجھے محمدؐ خان کراچی کے ان "نو نجدی" کا تار دکھلایا۔ جو مصر تک کے اخبارات کو بھیجا گیا تھا۔ اور کہا کہ اس کے متعلق کچھ کہنا ہو تو فرمائیے چنانچہ ڈاکٹر احمد فواد بے ترجمان بنے اور میں نے کوئی تین کالم کا انٹرویو دیا۔ جس میں اس خرافات کی اس طرح تردید کر دی جس طرح شوکت صاحب نے کی ہے اور اس کے بعد اسلام ملکیت، تقلید جادہ اور مولویت، احیائے خلافت راشدہ مؤتمر عالم اسلام کی ضرورت، حجاز کے لئے صحیح ترین طرز حکومت ابن سعود کے وعدوں اور وعدہ خلافیوں پر اپنے خیالات کو ایک مسلسل مگر مختصر طریقہ پر بیان کر دیا، جسے سب حاضرین نے نہایت ہی پسند کیا۔ شام تک انٹرویو کے پروف نہیں مل سکتے تھے اس لئے تو کل بخدا علی حسن صاحب ہی پر سب کچھ چھوڑنا پڑا اور ان سے کہہ دیا کہ کل کے "الاخبار" کے بارہ پرچے میرے نام لندن روانہ کر دو۔ ان مرد خدا نے نہ معلوم کیا کیا۔ اب تک ایک پرچہ دستیاب نہیں ہوا۔ البتہ ایک "صاحب ابوالنصر" جن کا خط مولانا ابوالکلام سے ہو بہو ملتا ہے، ان بیچارے نے ایک کاپی ارسال کی ہے یہاں آتے ہی بیرسٹر ٹامس کک کے ہاں سے خطوط اور اخبار لایا اور راستہ ہی میں ایک دو کالم "الاخبار" کے پڑھے۔ یہاں آکر اچھی طرح پڑھنے کا ارادہ تھا مگر اشرف[1] نے ڈرائنگ روم کے میز پر وہ لفافہ رکھ دیا جس میں ابوالنصر صاحب کا خط اور اخبارات تھے، وہ لفافہ باوجود کامل تلاش کے اب تک نہیں ملا۔ ورنہ آپ کو "ہمدرد" اور "خلافت" میں ترجمہ کے لئے کب کا بھیج چکا ہوتا۔ آج ہی تھک کر ڈاکٹر فواد بے کو لکھ رہا ہوں کہ بھائی "الاخبار" ہمارے دونوں اخبارات کو بھیجا کرو۔ اور اس تاریخ کے پرچہ کی چند کاپیاں فوراً یہاں بھی اور بمبئی اور دہلی بھی روانہ کر دو۔

---

[1] ڈاکٹر محمد اشرف مشہور کانگریسی لیڈر

اچھا اب آپ سے رخصت ہوتا ہوں یہ خط جعفری کے خط میں رکھ کر بھیج رہا ہوں،
تاکہ ماجد میاں اور ظفر الملک اور وہ بھی اس سے آگاہ ہو جائیں۔ اور پڑھتے ہی آپ کو روانہ
کر دیں۔ مصر کے حالات ان حضرات کے خط میں لکھوں گا۔ پھر یہاں کے حالات تفصیل کے
ساتھ قلمبند کر کے آپ کو یہاں کو ارسال کر دوں گا۔ مگر آئندہ ہفتہ میں۔ کل سے تین دن
کا فاقہ ہو گا اور مسہل بھی۔ آج کل صرف دو بار غذا ملتی ہے اور وہ بھی محض پھل۔ ورزش
بھی کرنا ہوتی ہے اور ڈاکٹر "مساج" یعنی مالش بھی کرتے ہیں۔ ماجد میاں کے خط میں ڈاکٹر
صاحب کے ایک لیکچر کا خلاصہ اور ایک مضمون بھیجتا ہوں جس سے ان کے طبی
خیالات آپ سب لوگوں کو معلوم ہو جائیں گے۔ اچھا اب رخصت

آپ کا دُور افتادہ بھائی
محمد علی

علاج

۵۱ - کاونڈش روڈ - لندن (این، ڈبلیو ۱۲)

۱۵ رجولائی ۱۹۲۸ء

پیارے جعفری - چند مطبوعہ کاغذات بھیجتا ہوں جن میں میرے معالج کے طبی خیالات کا اظہار کیا گیا ہے - میرا علاج انہیں کے مطابق ہو رہا ہے اور در اصل معمولی اصطلاح میں "علاج" نہیں ہے، بلکہ طرز بود و ماند کی اصلاح ہے -

اگر "اصلاح" سے فائدہ ہوا تو پھر ساری عمر اسی طرح بسر کرنا ہوگی - صرف دو وقت کھانا کھاتا ہوں اور ممکن ہے کہ ایک ہی وقت رہ جائے - پھلوں کے ساتھ گوشت کی اجازت نہیں ہے - نمک کو وہ غیر ضروری بلکہ مضر سمجھتے ہیں اور چونکہ گوشت بلا نمک اچھا نہ معلوم ہوگا اس لئے میں نے گوشت ترک کر دیا ہے، اور صرف پھل اور ترکاریاں (زیادہ تر کچی مثلاً کاہو اور ککڑی) کھاتا ہوں - مگر چونکہ شہد اور بالائی کی اجازت ہے اس لئے کچھ برا نہیں پڑ رہتا - ورزش صحیح طور پر سانس لینا اور مالش بھی جاری ہیں - اچھا اب رخصت ہوتا ہوں - کل سے تین دن کا فاقہ ہوگا - کل صبح کھانا نکالنے کے پیچھے سے ڈیڑھ چمچہ اینوز فروٹ سالٹ (ENO'S FRUIT SALT) ناپ کر پیوں گا اور صرف پانی پر گذر ہوگی - شکر اب بھی بہت کم ہو گئی ہے - صرف ۸ ء فیصدی رہ گئی ہے - پیاس بہت کم ہے پیشاب بھی کم آتا ہے - ایسٹون (ACETONE) اب نہیں ہے مگر البیومن (ALBUMEN) زیادہ آ رہا ہے گو ممکن ہے کہ ماہر تشریح کیمیاوی نے لکھنے میں غلطی کی ہو - اس وقت ۴ ء فی صدی ہے - پہلے ۱ ء فی صدی تھا - اس قدر زیادتی

بظاہر لکھنے کی غلطی معلوم ہوتی ہے ۱۴ر جولائی کو پھر فاقہ کے بعد قارورہ بھیجا جائے گا۔ اس وقت معلوم ہوگا کہ کیا حالت ہے۔ دعا کر کہ شفا نصیب ہو۔

تمہارا خیر طلب اور دُعا گو بھائی
محمدؐ علی

انشاءاللہ آئندہ اسی علاج اور اصلاح کے متعلق پیرس کے ڈاکٹر گلپا (DR. GUELPA) کے تجربات جنہیں ابھی پڑھ چکا ہوں درج کروں گا۔ ذیابیطس کے متعلق یہ فاقہ اور مسہل انہیں کا علاج ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

(۲)

لندن
۲- اگست ۱۹۲۸ء

پیاری زُہرہ بی

خداوند کریم تمہیں زاہد اور طارق اور شوکت صاحب اور سب اعزّہ و اقربا دوست احباب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ تمہارے کئی خط مجھے ملے۔ علیحدہ خطوط لکھنے میں وقت بہت صرف ہوتا ہے، اسی لئے میں ایک خط تمہاری بی کو لکھ دیا کرتا ہوں تاکہ دہلی اور رام پور والوں کو میرے حالات معلوم ہوتے رہیں، اور ایک خط ماجد میاں، ظفر الملک صاحب اور جعفری کو لکھ دیا کرتا ہوں جو "ہمدرد" میں بھی شائع ہو جاتا ہے تاکہ سب لوگ میرے حالات سے واقف ہو جائیں اور ایک خط تقریباً ایک ہفتہ شوکت صاحب یا عرفان صاحب کو لکھ دیا کرتا ہوں تاکہ تمہیں اور زاہد کو بھی تمام کیفیت معلوم ہوتی رہے۔ ایک ہی مضمون چھ سات مختصر سے خطوں میں لکھنے سے یہ بہتر ہے کہ ایک دو مفصل خط اس طرح ہر ہفتہ لکھ دیئے جایا کریں میں عمداً بدھ اور جمعرات کو کہیں باہر نہیں جاتا۔ نہ کسی کو اپنے گھر بلاتا ہوں تاکہ خطوط لکھ دیا کروں۔ مگر پھر بھی ڈاکٹر کے ہاں ضرور جانا ہوتا ہے، اور یہاں جب گھر سے نکلنا ہوتا ہے تو چار پانچ گھنٹہ سے پیشتر آنا ممکن نہیں ہوتا۔ اتفاق سے جمعرات کے دن اکثر کوئی ضروری کام نکل آتا ہے اور اس کے باعث گھر چھوڑ کر جانا ہی پڑتا ہے۔ اس لئے اکثر ایسا ہوا ہے کہ ڈاک کے معمولی وقت کے نکل جانے کے بعد بڑے ڈاکخانہ جاکر وہیں بیٹھ کر خط لکھنا پڑتا ہے اور وہاں ۶ بجے شام تک تو معمولی ٹکٹ سے خط نکل جاتے ہیں، لیکن ۷ بجے تک ۲ ؍ کا اور ٹکٹ لگانا پڑتا ہے اور ۸ بجے تک

۴ر کا اور ایک دفعہ تو اس کے بعد بھی ۲ر کا زیادہ ٹکٹ لگا کر ارسیلہ تک ہوائی جہاز کے ذریعہ سے خط بھیجنا پڑے ہیں۔

یہ سب تفصیلیں اس لئے لکھدی ہیں کہ تم یہ نہ سمجھو کہ میں تم سے غافل ہوں۔

زہرہ بی۔ میرا علاج جس طرح ہو رہا ہے اس طرح تم کو بھی اپنا علاج شروع کرانا پڑے گا۔ اور میں تم کو یقین دلاتا ہوں کہ انشاء اللہ تعالیٰ تم بہت جلد دُبلی ہو جاؤگی تمہاری صحت اچھی رہے گی اور تم خوب محنت کر سکو گی۔ تم کسی اچھے ڈاکٹر سے اپنے دل وغیرہ کا امتحان کرا کر میری طرح فاقہ کرنا شروع کرؤ اور دن رات میں پہلے صرف دو کھانے پر پھر ایک ہی پر اور جہاں تک ہو سکے صرف پھلوں پر گذر کرو۔ انشاء اللہ کبھی بیمار بھی نہ ہوگی۔ یہ طریقہ صرف ذیابطیس کے علاج ہی کا نہیں بلکہ ہر مرض کے علاج کا ہے نیاہد تو پھلوں کے عاشق ہیں ان سے کہو کہ اس طرح رہ کر دیکھیں۔

کیا تمہیں تعجب نہیں ہوتا کہ میں نے پانچ دن اور چھ راتوں سے کچھ نہیں کھایا ہے صرف چند نارنگیوں کا اور آدھ سیر انگوروں کا عرق ہی ہر روز پیا ہے اور اس روز میٹھا تم کو خط لکھ رہا ہوں اور ابھی ایک جگہ دعوت میں جا رہا ہوں۔ زیادہ حصہ پیدل ہی چل کر اور رات کو دار العوام میں جا کر مباحثہ سنوں گا۔ اور انشاء اللہ کل صبح کو پہلا کھانا کھاؤں گا۔ اور وہ بھی صرف پھل ہوں گے اور ہفتہ بھر تک سوائے پھلوں کے کچھ نہ کھاؤنگا شوکت صاحب سے بھی کہنا کہ آپ بھی یہ کر کے دیکھیں۔ پھلوں میں کسی پھل کی ممانعت نہیں ہے البتہ مجھے اور انہیں اور تمہیں کیلا نہیں کھانا چاہیئے۔ کھجوروں کی آموں کی انگوروں کی اجازت ہے۔ کوئی پھل ممنوع نہیں ہے مجھے مشکل ہی سے بھوک معلوم ہوتی ہے۔ بھوک تو معلوم ہوتی ہے مگر آج چھٹے دن بھی صرف اتنی ہے جتنی کہ پہلے دن معلوم ہوتی تھی۔ پہلا فاقہ تو تین دن کا کیا تھا اور اس میں تو پھلوں کا عرق بھی نہیں پیا تھا صرف پانی پی کر گذر کیا تھا اور تیسرے دن اس سے زیادہ بھوک نہیں لگی تھی جو پہلے

دن لگی تھی۔ ڈاکٹر یہی کہتا تھا تو یقین نہیں آتا تھا مگر اب تجربہ کر کے دیکھ لیا اور میں تو ۱۲ دن کا فاقہ کرنے کو بھی تیار ہوں۔

طارق میاں کا جس دن میرے ننھے منھے خط کے جواب میں خط آئے گا اُس دن ان کو بھی خط لکھوں گا۔ زاہد کو انشاء اللہ تعالیٰ اگلے ہفتہ خط لکھوں گا جس میں یہاں کے ٹینس اور کرکٹ کا حال ہوگا۔ شوکت صاحب سے کہہ دینا کہ اگلے ہفتہ انشاء اللہ ان کو بھی مفصّل خط لکھوں گا۔

انصاری صاحب اور مہاتما جی دونوں نے جو طریقہ مسلمانوں کے متعلق اختیار کر رکھا ہے اس کو سنکر سخت تکلیف ہوتی ہے۔ شوکت صاحب سے کہہ دینا کہ موتی لعل کی صدارت (میں) کانگریس کی سخت مخالفت کریں اور کہہ دیں کہ اگر جواہر لال صدر نہ ہوا تو مسلمان مخالفت کریں گے۔ الحمدللہ کہ شعیب صاحب خوب مضبوط ہیں۔

اچھا اب رخصت۔ سب کو پیار۔ طارق میاں کو خوب سا پیار میری طرف سے کہہ کر کر لینا۔

تمہارا خیر طلب
محمد علی

(۱۳)

غریبانِ وطن کا قبرستان

۱۹۔ اگست　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　لندن

پیارے ماجد میاں، ظفر الملک صاحب اور جعفری

گزشتہ ہفتے میں جو "ہمدرد" کے پرچے آئے ان میں میرے کسی خط کا کوئی ذکر نہ تھا جس سے مجھے اندیشہ ہوا کہ شاید وہ خط جو یورپ پہنچ کر میں نے لکھا تھا، اور ۲۱ رجون کو ڈوور کے اسٹیشن پر ڈالا تھا وہ ۱۱، ۱۲ رجولائی تک آپ حضرات کی نظر سے نہیں گزرا، اور اگر ماجد علی صاحب کے خط میں صاف تصریح نہ ہوتی کہ اُنہوں نے حیات صاحب کو اس تاکید کے ساتھ روانہ کر دیا ہے کہ وہ اس خط کو پڑھ لینے کے بعد فوراً جعفری کو بھیج دیں تو میرے دل میں ضرور یہ خوف بھی پیدا ہو جاتا کہ بیگم صاحبہ نے حیات صاحب کو وہ خط تو بھیج دیا مگر یہ لکھنا بھول گئیں کہ پڑھنے کے بعد وہ خط جعفری صاحب کو بھیج دیا جائے تاکہ اِن مندرجہ حالات سے قارئین "ہمدرد" بھی واقف ہو جائیں۔

جب تفصیل کیساتھ کسی چیز کے متعلق لکھنا پڑتا ہے۔ تو پھر نا ممکن ہو جاتا ہے کہ اُس کو ہر خط میں دہرایا جائے۔ اسلئے میں نے یہ انتظام کیا تھا کہ کسی نہ کسی کو ہر ہفتے مفصل خط لکھ دیا جائے اور وہ اُسے آپ حضرات تک پہنچا دیا کریں۔ ۲۱۔ جون کا خط اس قدر طویل تھا اور اسی مصروفیت کی حالت میں لکھا گیا تھا کہ اس کے بعد کسی اور کو دو سطریں لکھنا بھی مشکل تھا۔ چنانچہ بے چاری بیگم صاحبہ تک کو اس ڈاک سے علیحدہ خط روانہ نہ کیا جا سکا، لیکن چونکہ ان کی اور بچیوں کی پریشانی کا سب سے زیادہ خیال تھا اس لئے میں نے حیات صاحب کا خط بجائے مکتوب الیہ کو بھیجنے کے بیگم صاحبہ کے پتہ

سے بھیجدیا۔ چونکہ اس ہفتہ کی ڈاک کے "ہمدرد" میں بھی اس کا کہیں ذکر نہیں کیا گیا ہے اس لئے مجھے اندیشہ ہوا کہ شاید حیات صاحب اسے دہلی بھیجنا ہی بھول گئے اور چونکہ آپ کو بظاہر اس خط کا کوئی علم نہیں اس لئے آپ غالباً ان کو بھی نہیں لکھیں گے کہ آپ کی یاد دہانی پر وہ اسی خط کو آپ کے پاس بھیج دیں، اسلئے مجبوراً میں خود آپ کو لکھ رہا ہوں کہ اُن سے وہ خط ضرور منگا لیں۔ وہ پہلی ستمبر کو غالباً بمبئی سے نواب صاحب بھوپال کے ہمرکاب روانہ ہوں گے۔ اِس خط کو ملتے ہی اُن کو لکھ دیجئے کہ وہ اپنے خط میں آپ حضرات کو شریک کرلیں۔ مجھے خوف ہے کہ میں نے لندن سے جو ڈاک پہلی بار ارسال کی اُس میں کوئی خط آپ حضرات کے نام ارسال نہیں کیا، لیکن بیگم صاحبہ کو، بچیوں کو اور ماجد علی صاحب کو خطوط لکھدیئے تھے اور نیز شوکت صاحب کو اور سب سے زیادہ تفصیل کے ساتھ چونکہ بیگم صاحبہ ہی کو لکھا گیا تھا اس لیے اُن سے درخواست کی تھی کہ وہ اپنے خط کا ایک حصہ شوکت صاحب کو اور جعفری کو بھجوا دیں۔ مگر وہ اس شرکت کو گوارا نہیں کرتیں۔ اور ان کے پچھلے خط میں لکھا ہوا آیا ہے کہ آپ میرے خط میں کسی کو شریک نہ کیجئے۔ خواہ کتنا ہی مختصر خط ہو وہ میرے لئے مخصوص ہونا چاہئے۔ مجھے کاٹ بیٹنے کی فرصت نہیں۔ معلوم نہیں کہ اسکے بعد اُنہوں نے اِس خط کی نقل جعفری کو بھیجی یا نہیں؟ بہرحال "ہمدرد" میں اس کا کہیں ذکر نہ تھا اور اگر وہ بھیجی بھی گئی ہے تو غالباً جمعرات تک آپ حضرات کو مل گئی ہوگی۔ خیر، اب یہ انتظام کیا جاتا ہے۔ کہ سب سے زیادہ مفصل خط بالعموم آپ ہی کے نام جایا کرے گا۔ اور جو دوسرے خطوط لکھے جائیں گے۔ ان میں سب کا حوالہ دیدیا جائے گا۔ کہ بعد ادائے آداب کے عرض پرداز ہوں کہ یہاں خیریت ہے اور آپ کی خیریت درگاہ سے نیک مطلوب ہے۔ بڑوں کو سلام چھوٹوں کو دعا تمت تمام شد۔

پہلے اپنی صحت کے متعلق عرض کردوں کہ اس بار ۷ دن کے فاقہ سے جسمیں نارنگی اور انگور کا عرق پینے کی اجازت تھی میری طبیعت بہت اچھی ہوگئی اور یہی نہیں کہ

شکر نہیں آئی بلکہ باوجود چربی کے تقریباً اسی مقدار میں پائے جانے کے جو گزشتہ ہفتہ میں تھی میرے پاؤں کے تلووں میں اعصابی سوزش بالکل نہیں ہوئی۔ البتہ گزشتہ ہفتے کے دن چند نوجوان طلبا کے ساتھ زیجنبش پارک میں چڑیا گھر ZOOLOGICAL GARDEN دیکھنے کے لئے جانا پڑا اور چونکہ اس دن صبح کو بہت ہی کم پھل کھائے تھے اس لئے ان طلباء کیساتھ چائے میں شریک ہو گیا۔ افسوس کہ یہاں شہد نہ مل سکا اور شکر کا استعمال کرنا پڑا۔ اس دن میں نے خوب ہی بد پرہیزی کر ڈالی اور مکھن روٹی اور جیم کا بھی استعمال کیا اور کیک کے بھی دو ایک ٹکڑے کھائے۔ یہ میری پہلی بد پرہیزی تھی ورنہ نہ کبھی شکر کا استعمال کیا اور نہ کبھی جیم کا اور نہ کبھی کیک کا یہاں تک کہ روٹی بھی تقریباً ڈیڑھ مہینے سے نہیں کھائی گو میرے دوست احباب کو شاید اس کا یقین نہ آئے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب بد پرہیزی کرنا پڑی تو میں نے عمداً پیٹ بھر کر بد پرہیزی کر لی تاکہ دیکھوں اس کا اثر کیا ہوتا ہے چنانچہ چند ہی گھنٹوں کے بعد سزا بھی پائی۔ پورے ایک ہفتے کے بعد تلووں میں اعصابی سوزش پھر شروع ہوئی۔ اور اس کا کچھ نہ کچھ اثر کل تک رہا۔ البتہ آج ایک وقت کا فاقہ کرنے کے بعد الحمدللہ وہ کیفیت بالکل دور ہو گئی اور اس شیریں تجربہ نے میرے یقین کو اور بھی پختہ کر دیا کہ میرے معالج غذا کے متعلق جو کچھ کہتے ہیں وہ یقیناً صحیح ہے۔ اس ہفتے سوائے اس بد پرہیزی کے میں نے ان کے کہنے پر اس قدر اور بھی عمل کیا کہ گوشت مطلق نہیں کھایا۔ بلکہ سوائے تھوڑی سی اُبلی ہوئی مٹر کے کوئی پکی ہوئی ترکاری بھی نہیں کھائی اور صرف پھلوں پر گزر کیا۔ مگر پھلوں میں علاوہ نارنگیوں کے اور ناشپاتیوں کے اور خوبانیوں وغیرہ کے کچھ گریاں بھی کھائی گئیں (بادام، اخروٹ وغیرہ) اور لطف یہ ہے کہ کھجوریں بھی روزانہ بیس پچیس کھائی گئیں۔ اسلئے اس پرہیز میں شکایت کا ذرا بھی موقع نہ ملا۔ ارادہ ہے کہ پھر فاقہ وہ کیمیاوی تجربہ کے لئے بھیجوں تاکہ معلوم ہو جائے کہ فاقہ نہ کرنے کے بعد بھی

شکر مفقود رہتی ہے یا نہیں۔ ورزش کے معاملے میں البتہ بہت کچھ فرو گذاشت ہوئی ہے لیکن آج سے ارادہ کر لیا کہ دن میں کم سے کم دو تین بار ورزش ضرور کیا کرونگا۔ ڈاکٹر صاحب کا قول ہے کہ صحیح غذا سے زیادہ صحیح ہوا کی ضرورت ہے اور جب تک اندر کی ہوا پوری طرح باہر نہ نکالی جائے گی جسم کا اندرونی حصّہ صاف نہ ہوگا اور تمام ورزشیں اسی غرض سے کرائی جاتی ہیں کہ میں سانس صحیح طریقے سے لے سکوں۔ چربی پوری طرح سانس لینے میں مانع نہ ہوتی رہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر میری سانس لمبی ہو گئی تو غذا بھی زیادہ ہضم کی جاسکے گی اور تھوڑی بہت بد پرہیزی سے بھی زیادہ نقصان نہیں پہنچے گا۔ بہرحال یقیناً اس ڈیڑھ مہینے کے علاج میں اتنا افاقہ ہوا ہے جو اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا اور میں شوکت صاحب کو بھی لکھنے والا ہوں کہ وہ بھی اب پھلوں پر گزارہ کیا کریں اور جس طرح سے میں زمین پر لوٹ لوٹ کر اور دوسری ورزشوں میں لمبی لمبی سانسیں لیا کرتا ہوں وہ بھی لیا کریں۔ میرا وزن سات سیر گھٹ چکا ہے۔ کمر چار انچ کم ہو گئی ہے۔ اور سانس ایک سو ستر سے ترقی کر کے دو سو تک پہنچ گئی ہے۔ اُن کا وزن تو یقیناً بیس پچیس سیر گھٹ جائے گا۔ بلکہ اس سے بھی زائد۔ اور وہ تھوڑے ہی عرصے میں مصرعہ

کمر پتلی صراحی دار گردن

کے مصداق ہو جائیں گے۔ بیگم صاحبہ بیچاری مدت سے دُبلا ہونا چاہتی ہیں۔ ان کے لئے بھی یہی علاج مفید ہوگا اور چونکہ وہ نقرس کے مرض میں مبتلا بھی ہیں۔ اس لئے یہ طریق علاج اس مرض کے لئے بھی مفید ثابت ہوگا۔ میں بار بار زور دے رہا ہوں کہ لڑکیوں کو لیکر وہ بھی یہیں چلی آئیں اور ابھی اسی مضمون کا تار اُنہیں دے چکا ہوں۔ حمیدہ کی بیماری نے بیحد پریشان کر دیا ہے۔ اگر وہ یہاں آگئیں تو حمیدہ بی کا بھی اسی طریقے پر یہاں علاج شروع کرا دیا جائیگا۔ لیکن دیکھئے وہ آتی بھی ہیں یا نہیں؟

جہاں اس قدر اپنی صحتیابی کے متعلق لکھ چکا ہوں اور وہاں چند سطریں ایک بزرگ

قوم کی وفات کیمتعلق بھی لکھنا نامناسب نہ ہوگا۔ جمعہ کی صبح کو میں نے اپنا فاقہ ختم کر دیا۔
ڈاکٹر صاحب چاہتے تھے کہ دو دن اور فاقہ کیا جائے لیکن چونکہ میں امام صاحب سے
وعدہ کر چکا تھا کہ ناٹنگل گیٹ کے دار الصلواۃ میں نماز کے بعد مصلیوں سے اسلام کے
متعلق ایک مختصر سے مکالمے کی بھی ابتدا کروں اور خوف تھا کہ اگر اسی دن" افطار نہیں
کیا گیا تو شاید کمزوری زیادہ محسوس ہو۔ لیکن جو حالت جمعرات کو تھی اگر اس کا پہلے سے
ذرا بھی گمان ہوتا تو میں ہرگز جمعہ کو افطار نہ کرتا اور دو چار دن اور فاقہ کرتا۔ کیا معلوم
تھا ٹھیک جس وقت میں افطار کر رہا تھا اُسی وقت سید آمیر علی صاحب دنیا سے رخصت
ہو رہے تھے وہ لندن سے کچھ دور سسکس کاونٹی کے ایک چھوٹے سے قصبے میں اس
زمانے میں آرام فرما رہے تھے اور مسز امیر علی صاحبہ کے قول کے مطابق آخر وقت
تک کام کرتے رہے۔ گو کچھ عرصے سے وہ صاحب فراش تھے اور ایک نرس کے ساتھ
ہی وہ چلا پھرا کرتے تھے۔ تاہم کسی کو گمان نہ تھا کہ وہ اس قدر جلد داعی اجل کو لبیک کہنے
والے ہیں، یہاں جس طرح جینا مشکل ہے اُسی طرح مرنا بھی مشکل ہے جس دن آمیر علی
صاحب کا انتقال ہوا اُسی دن لوگ چھٹیاں منانے جا رہے تھے تجہیز و تکفین کرانے
والے پیشے کی یہاں ایک کمپنی ہے چنانچہ اسی نے مرحوم کی میت کو رڈچ سے ویسٹ
منسٹر تک پہنچایا ہوگا اور منگل کے دن تعطیل ختم ہونے پر تابوت بنانے کا انتظام کیا۔
اسی کمپنی کی ایک اسپیشل ٹرین واٹرلو اسٹیشن سے منگل کے دن بارہ بجے کے قریب بروک وڈ
BROOK WOOD کو جو ووکنگ WOKING اور ایلڈر شاٹ -ALD
ER SHOT کے درمیان واقع ہے روانہ ہوئی اور اس میں جنازہ اور اس کو
کاندھا دینے والے روانہ ہوئے۔ یورپین رسم کے مطابق پھولوں سے تابوت چھپ گیا
ہوگا۔ اسلئے کہ جب میں قبرستان پہنچا تو قبر پھولوں سے بالکل ڈھکی ہوئی تھی۔ میں چند طالب
علموں کیساتھ موٹر میں روانہ ہوا تھا۔ مجھے پہلے اس کا علم نہ تھا کہ لوگ اسپیشل میں قبرستان

جانے والے ہیں۔ اتوار کی شب کو سر محمد رفیق صاحب سے ملاتب اُس کا حال معلوم ہوا اور میں
اس سے پہلے ہی موٹر کا انتظام کر چکا تھا۔ احتیاطاً ہم لوگ اسپیشل سے بھی پہلے موٹر میں
لندن سے روانہ ہوئے لیکن بدقسمتی سے اُدھ بیچ میں موٹر رُک گئی اور اس کے صاف
کرنے میں موٹر کے مالک کو کچھ غلط فہمی ہوئی جس کے باعث گھنٹہ بھر تک راستے میں رُکنا
پڑا۔ بالآخر گزرتی ہوئی ایک موٹر کے چلانے والے سے درخواست کی گئی کہ "آٹو موبائل
ایسوسی ایشن" کے سپاہی کو آگے چل کر بھجوا دیں۔ یہ مالکانِ موٹر کی ایک جمعیت ہے جس کا
سالانہ چندہ دو پونڈ ہے اور اس کی طرف سے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر عمدہ وردی
پہنے ہوئے سپاہی بٹھلا دیئے گئے ہیں جو موٹر والوں کو راستہ بھی بتاتے ہیں اور اگر کوئی
حادثہ واقع ہو جاتا ہے تو موٹر اور موٹر والوں دونوں کی مرہم پٹی کرتے ہیں۔ ان کے پاس
موٹر بائسکلیں ہیں جن میں ساڈ کار کی جگہ ایک چلتی پھرتی موٹر والوں کی ڈسپنسری ہے۔
اس سپاہی کے آنے ہی سب کچھ ٹھیک ہو گیا اور ۲۰ منٹ میں برک وود BROOK
WOOD کے قبرستان جا پہنچے۔ ووکنگ کی مسجد کے امام صاحب نماز جنازہ پڑھا
چکے تھے اور سید امیر علی صاحب ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی سپرد خاک کئے جا چکے تھے۔
البتہ اُن کے صاحبزادے وارث امیر علی صاحب مع اپنی والدہ ماجدہ کے اس وقت
تک وہیں موجود تھے چنانچہ قبر پر فاتحہ پڑھنے کے بعد میں اُن کے پاس گیا اور تعزیت
کی۔ اس قبرستان میں ہزاروں ہی قبریں ہیں اور اس شہر خموشاں کا نام بھی -NEC
ROPOLIS ہے۔ ریل کی پٹڑی اس کے اندر تک آتی ہے، نہایت وسیع میدان میں
باغ لگایا گیا ہے جسکے چاروں طرف پختہ احاطہ کی دیوار ہے۔ نہایت عمدہ سڑکیں اور روشیں
چلنے پھرنے والوں کے لئے بنا دی گئی ہیں۔ بلکہ گھر آنے کے بعد ہمیں معلوم ہوا کہ ہم کو
لنچ نہ ملنے کے باعث جو چار کے وقت ووکنگ جا کر انڈے وغیرہ تلوانا پڑے اس کی
ضرورت نہ تھی۔ اس شہر خموشاں کے اندر ایک اچھی خاصی رسٹوران بھی موجود تھی۔ جہاں

لنچ کھایا جا سکتا تھا۔ یہاں ایک چھوٹا سا حصہ مسلمانوں کی قبروں کے لئے بھی ہے اور ایک حصہ پارسیوں کی قبروں کے لئے اور اسی طرح ایک حصہ ہندوؤں کی قبروں کے لئے ہے، مگر سید امیر علی صاحب نے عین جیتے جی ہی میں ایک قطعہ اپنے اور اپنے خاندان والوں کیلئے اُس طرف خرید لیا تھا جہاں متمول عیسائی دفن ہوتے ہیں۔ یوں تو تجہیز و تکفین کا انتظام کرنے والی کمپنی نے سب کچھ کر لیا ہے لیکن بعد کو معلوم ہُوا کہ قبر کا رُخ کسی قدر غلط تھا۔ لیکن الحمد للہ کہ کچھ زیادہ غلطی نہ تھی۔ دفن کرتے وقت قطب نما تلاش کی گئی اور ایک شخص کے پاس مل بھی گئی۔ اس کے دیکھنے سے معلوم ہُوا کہ قبر کی سمت میں صرف تھوڑی سی کجی تھی زیادہ نہ تھی اور امام صاحب نے میت کا منہ صحیح طور پر قبلہ کی سمت موڑ دیا تھا۔ ہم لوگ جب پہنچے تو قبرستان میں پندرہ بیس آدمی ہی رہ گئے تھے جن میں ایک لارڈ ہیڈلے اور پنجاب کے سابق لفٹنٹ گورنر سر لوئی ڈین تھے۔ لارڈ ہیڈلے کے پاس ہی ایک اور بزرگ بھی تھے جن کا اسمِ گرامی انگلستان کے اخبارات اور رسالوں میں بانو جنگ افغانستان کے بعد یکایک نظر آنا شروع ہُوا تھا یا اب پھر دو سال سے مکہ معظمہ کی موتمر عالم اسلام کے بعد سے زیادہ تر اسی سلسلے میں پھر نظر آنے لگا ہے۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ بزرگ کون ہیں۔ یہ "سردار" اقبال علی شاہ صاحب تھے۔ چونکہ اس سے ایک ہی روز پیشتر مجھ سے ان بزرگ سے ٹیلیفون پر گفتگو ہو چکی تھی جس کے متعلق میں ابھی کچھ عرض کرونگا۔ اور مجھ سے مایوس ہو چکے تھے۔ اسلئے اس بار علیک سلیک کی بھی نوبت نہ آئی۔ سر لوئی ڈین صاحب نے مجھے پہچان کر اُردو میں مزاج شریف کہہ کر میرا حال دریافت فرمایا اور فرمایا کہ ہاں میں آپ کو اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ میں جواب میں الحمد للہ کہہ کر اور اُن سے ہاتھ ملا کر آگے بڑھا۔
مجھے امیر علی صاحب کی قبر کا اور مسلمانوں کی قبروں سے اتنے فاصلے پر ہونا اور متمول انگریزوں کی قبروں سے اس قدر متصل ہونا کچھ زیادہ اچھا نہیں معلوم ہُوا۔ مسلمانوں کی قبریں غالباً پہلے یہاں نہ تھیں۔ جتنے کتبے ملے اُن سب کو میں نے پڑھا اور معلوم ہُوا کہ سب سے

پرانی قبر ایک خاتون ضعیفہ احمد فارسی کی ہے، جس وقت یہ بیچاری دفن ہوئی تھیں اُس وقت شاید کسی کے پاس قطب نما بھی نہ ہوگی اس لئے کہ قبر کی سمت صحیح نہیں ہے۔ اس کے پاس ہی بمبئی کے مشہور و معروف اور نہایت قابل مسلمان ڈاکٹر حبیب جان محمد صاحب کی قبر ہے جن کا یکایک ذیابیطس کے عارضہ میں نیشنل لبرل کلب میں انتقال ہوگیا تھا۔ اسی قبرستان میں حیدر آباد کے خطیب امجد حسین کھوکھر ضلع جہلم کے شیخ عبدالمجید اور رانڈیر کے داؤد ابراہیم موتالا کی بھی قبریں ہیں جن میں سے مؤخر الذکر کا موٹر کے تصادم سے اسی سال انتقال ہوا ہے اور ان کے ایک رفیق جو اسی تصادم میں زخمی ہوئے تھے اس بار ہمارے شریکِ سفر تھے۔ انہیں قبروں میں ایک قبر مصطفےٰ صبحی منزلوی کی ہے جو مصری تھے۔ نیز ایک قبر آغا خاں صاحب کے چچازاد بھائی اور حاجی بی بی صاحبہ کے بھائی آغا شمس الدین شاہ کی بھی ہے۔ اس قبر پر غالباً آغا خاں کی طرف سے یہ عبارت کندہ کی گئی ہے۔

"برادرم عزیز، شعر

زرفتنِ تو من از عمر بے نصیب شدم
سفر تو کردی و من در وطن غریب شدم

آغا خاں صاحب کو کون غریب کہے گا، لیکن ان کی "غریب الوطنی" اب ایک ضرب المثل ہے۔ نہ معلوم اس شعر میں کس وطن کی غربت کی طرف اشارہ ہے۔ ان بڑی بڑی پختہ قبروں کے علاوہ کتنی ہی کچی قبریں بھی ہیں اور چند پر بظاہر حکومت کی طرف سے دورانِ جنگ میں لوحِ مزار بھی لگا دی ہیں چنانچہ حسب ذیل فوجی یہاں دفن ہیں . . . .

. . . .

. . . . میں ان سب کے لئے فاتحہ پڑھ کر آیا ہوں اور ان کے نام اسلئے لکھ لایا ہوں کہ اگر "ہمدرد" کے ذریعہ سے ان کے دور افتادہ پسماندوں کو جن میں سے شاید ہی کوئی ادھر آنکلے، اطلاع مل جائے کہ ایک مسلمان ان کی قبروں پر فاتحہ پڑھ آیا ہے، تو غالباً انہیں

خوشی ہوگی۔

ان مسلمانوں کی قبروں میں ایک عجیب و غریب قبر بھی نظر پڑی۔ وہ ایک ہندو سپاہی کی تھی جس پر انا للہ و انا الیہ راجعون کی جگہ .... کھدا ہوا تھا۔ نہ معلوم یہ ادوم بھگوتی نام تو نہیں اور ادوم کی جگہ غلطی سے فقط .... کھد گیا۔ مجھے اس وقت اس کی اطلاع نہ تھی کہ یہاں ہنود کا بھی کوئی قبرستان ہے اور قیاس بھی اس کے خلاف تھا، اسلئے کہ ہنود کے مردے تو جلادئے جاتے ہیں۔ اس لئے صرف اس ایک ہندو کی قبر کو دیکھ کر تعجب ہوا۔ اس کا نام موتی رام نمبر ۱۱۲۔ الفنٹری ..... کھدا ہوا تھا جب ہم وہاں سے چل دیئے تو معلوم ہوا کہ ایک حصّہ ہنود کی قبروں کے لئے بھی ہے اور وہاں ہنود کی قبریں بھی موجود ہیں۔

مسلمانوں سے کچھ ہی فاصلے پر پارسیوں کی متعدد قبریں ہیں اور یہ حصّہ بہت زیادہ شاندار ہے سب سے زیادہ عظیم الشان قبر تو داڈیا صاحب کی ہے، جس کے متعلق میں ابھی عرض کرونگا۔ اس کے علاوہ ایک مسقف حجرہ کے اندر سر رتن ٹاٹا کی قبر ہے اور دوسرے میں ان کے والد ماجد جمشید جی نوشیرواں جی ٹاٹا کی قبر ہے اس کے سامنے جمشید جی کی ہمشیرہ مسز داراب جی سکلاتوالا کی قبر ہے جس پر اُن کا مجسمہ (صرف سر اور گردن وغیرہ) پتھر کا کھدا ہوا لٹا دیا گیا ہے۔ داراب جی صاحب کی قبر بھی وہیں ہے۔ غالباً یہ شاپور کے والد ماجد اور والدہ ماجدہ کی قبریں ہیں۔ مسز داراب جی کے چہرہ پر، اور بالخصوص آنکھ کے پاس کسی پرند کی بیٹ پڑی ہوئی تھی، جسے میں نے وہاں سے علیحدہ کر کے صاف کردیا اور شاپور جی کے لئے دعا مانگی کہ یہ بہادر اور سچا ہمدرد نوع انسان اور محب وطن انسانوں اور ہندوستانیوں کی کامیابی کے ساتھ خدمت کرتا رہے۔

مگر دیکھنے کے قابل داڈیا صاحب کی عالیشان قبر ہے۔ اس شہر خموشاں میں آنسو گرانا تعجب کی بات نہیں، مگر ہنسی آنا ضرور تعجب انگیز ہے۔ لیکن ہم میں سے ایک

بھی اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکا جب کہ ہم نے ایک جانب اس کتبہ کو پڑھا۔

I AM NOWROSJE NASHIRWANJE WADIA
OF THE ANCIENT ARYAN RACE OF PERSIA.
A CITIZEN OF THE LOYAL . TOWN OF
BOMBAY WHO LIE HERE PEACEFULLY UNDER
THE FAR OFF SKY OF WIDE FAMED BRITAIN.

(اس کا ترجمہ آپ ہی فرمادیں!) نہ معلوم وہ بمبئی جس میں نریمان اور بھروچہ جیسے پارسی آج بھی ہیں جس میں دادا بھائی نوروجی اور فیروز شاہ مہتا اور جمشید جی نوشیرواں جی ٹاٹا اور رتن ٹاٹا جیسے پارسی گزر چکے ہیں وہ واڈیا صاحب کے اظہار "وفاداری" اور اس قدر اصرار کے متعلق کیا کہے گا۔ کیا بمبئی میں صرف جنس وفاداری ہی ملتی ہے، حق پرستی، حب وطن اور حریت کی جنسوں کا وہاں کال ہے؟ برطانیہ کی شہرت یقیناً دور دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ خواہ وہ کیسی ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کے آسمان کو کیوں "دور" کہا گیا ہے۔ ہر جگہ کا آسمان وہاں کی زمین سے یکساں فاصلے پر ہوگا، یہ برطانیہ کا آسمان اس قدر دور کیوں ظاہر کیا گیا؟ اس کتبہ کو جس نے پڑھا، وہ بے اختیار ہنس پڑا۔ مگر آنجہانی واڈیا صاحب کا اس میں قصور نہیں ہے۔ "مردہ بدست زندہ" بظاہر ان کے کسی "وفادار" پسماندہ نے اُن توقعات کی بنا پر جو اُنہیں "دور دور مشہور" "برطانیہ" سے ہیں برطانیہ کے آسمان اور "وفادار" بمبئی کی زمین کی اس طرح مٹی پلید کی ہوگی۔ لیکن یہ عبارت بظاہر کسی پارسی کی بھی تصنیف کردہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ باقی تین جانب جو کتبے ہیں۔ ان کی عبارتوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والے کو ژند اوستا سے کہیں زیادہ بائبل پر عبور رہے۔ "اَہورمزد" کا نام تو صرف ایک جگہ آیا ہے لیکن *Saviour - Redeemer* کے القاب کی تکرار کی گئی ہے *Father of his children* لعنی مسیح

LORD GOD کی ذیل کی عبارت کو پڑھئے تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ کسی عیسائی کی تصنیف کردہ ہے:۔

THOU WHO OPENEST THE GATE OF THE MORNING TO ASCENDING SUN. O. THOU SUN OF RIGHTEOUSNESS ARISE WITH HEALING IN THY WINGS & LIFT UP THE LIGHT OF THY COUNTENANCE ON US THAT IN THY LIGHT WE MAY SEE THE LIGHT OF LIFE EVER LASTING.

ہم یہاں سے چلے تو لڑکوں کو بھوک لگی تھی۔ اس لئے دوگنگ میں داخل ہوتے ہی کا ٹیرج ہوٹل ملا۔ وہاں موٹر رکی اور ہوٹل میں داخل ہو کر خانساماں یا "خانِ ساماں" کی تلاش کی۔ ایک میم صاحبہ، جو غالباً مالکہ تھیں، نکل آئیں اور پہلے تو چائے دینے کا وعدہ فرمایا۔ لیکن جب میں آگے بڑھا اور میں نے پوچھا ع

کہئے کچھ اور بھی ہمت ہو گی

یہ لڑکے بھوکے ہیں، لنچ اب تک نہیں کھایا ہے تو انہوں نے گھبرا کر چائے دینے سے بھی انکار فرما دیا۔ ہمارا قیاس ہے کہ انہیں "شیخ" سے خوف آیا، اور ان کو اندیشہ ہوا کہ کہیں "شیخ" اپنی عبا میں ہوٹل کے چھری کانٹے اور چمچے دبا کر نہ لے جائے یا کہیں مالکہ ہی کا مالک نہ بن بیٹھے۔ میں نے دو تین ہی دن ہوئے اپنے مکان سے قریب ہی سینما میں وہ فلم دیکھا جس کا عنوان THE SHEIKH'S SON ہے اور جس میں رُوڈلف ویلینٹینو ..... آنجہانی مراقش کے ایک نوجوان "شیخ زادہ" کا پارٹ کرتا تھا۔ ان فلموں کو دیکھ کر کچھ تعجب نہیں۔ اگر ان ممالک والے اس اندیشہ سے متردد ہوں کہ اگر "شیخ زادوں" کی دراز دستیاں یہ ہیں تو نہ معلوم خود "شیوخ" کی دراز دستیاں

کیسی ہوں گی۔جی میں آیا کہ ہوٹل کی مالکہ صاحبہ کو مجبور کیا جائے کہ قانون کی رُو سے وہ ہمارا مطالبہ مسترد نہ فرمائیں لیکن انکی سراسیمگی پر رحم آیا اور قصبے میں آگے جاکر ایک رسٹوران میں چائے پی گئی، سلاد کھایا گیا اور انڈوں کے آملیٹ جس کو خانساماں "مالیٹ" کہتے ہیں، لڑکوں کو کھلائے گئے (چکھ میں نے بھی لیا!)

اب ذرا "سردار" اقبال علی شاہ صاحب کا حال سُنئے۔ آپ سے زیادہ کون جانتا ہے کہ ان "خورد دار" نے علی برادران کے خلاف کیا کیا زہر اُگلا ہے۔ یہ افغانوں کے اُس مشہور خاندان کے ایک سپوت ہیں جو غالباً حکومت افغانستان کے خلاف کچھ کارروائی کر کے ہندوستان بھاگ آیا تھا۔ اور یہاں سردھنہ ضلع میرٹھ میں آکر بنا گزین ہوا تھا۔ اس خاندان کے بہت سے افراد سے مجھے نیاز حاصل ہے، اور بعض تو علیگڈھ میں ہمارے ساتھ پڑھتے بھی رہے "سردار" اقبال علی شاہ صاحب بھی علیگڈھ کے پُرانے طالب علم ہیں، اور جب میں ۱۹۱۳ء میں سید وزیر حسن صاحب کے ساتھ یہاں آیا تھا، اُس وقت آپ ایڈنبرا میں تعلیم پاتے تھے۔ امتحان تو یہاں شاید ایک بھی پاس نہیں کیا مگر ایک میم صاحبہ سے شادی ضرور کر لی۔ سُنا ہے کہ ایک عرصے تک تو اُن کے والدِ ماجد نے جو تحصیلدار تھے کچھ روپیہ بھیجا، لیکن اس کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔ ان کے علیگڈھ کے ایک رفیق کے پاس ان کا ایک طول طویل خط ہے، جس میں اُنہوں نے اپنی اقتصادی مشکلات کی داستان کو دہرایا ہے اور پھر بتایا ہے کہ کس طرح غازی امان خاں کے اعلانِ جنگ کے بعد ان مشکلات کا حل اس طرح نکل آیا کہ اُنہوں نے یہاں کے اخبارات کو برطانیہ کی تائید میں مضامین بھیجے، جو پہلے تو مسترد ہوتے رہے لیکن بعد کو انڈیا آفس کے ایما سے اور مجھے یقین ہے کہ "اصلاح" کے بعد شائع ہونے لگے۔ جب میں ۱۹۲۰ء میں پھر یہاں آیا تو یہ بھی مجھ سے ملنے آئے مگر میں نے التفات نہیں کیا، البتہ حیات صاحب کی مروت نے انہیں مجبور کیا کہ ملاقات سے انکار نہ کردیں۔ اسلئے دو ایک بار آپ ہمارے

مکان پر تشریف لائے۔ ۱۹۲۵ء میں آپ مجھ سے دہلی میں ملے اور "کامریڈ" کے اشاعت میں نوکری کی خواہش کی اور نمونۃً ایک مضمون بھی لکھ کر دیا۔ میں اگر ان پر اعتماد کر بھی سکتا۔ تب بھی اس مضمون نے ان کی قابلیت کی اس طرح قلعی کھول دی کہ ان کو نوکری دینا میرے لئے ناممکن ہو گیا اور زیادہ سے زیادہ یہ کر سکا کہ ان کے سخت اصرار پر ان کے مضمون کی عبارت کو بار بار اصلاح دے کر اسے "کامریڈ" میں چھاپ دیا گیا۔ اس کے بعد انہوں نے THE NEW SPECTATOR نام کا ایک ہفتہ وار پرچہ خود نکالنا شروع کیا جس کو یہ میرے نام بھی بھیجتے رہے۔ پہلا پرچہ بھیجتے وقت جو خط میرے نام آپ نے ارسال فرمایا تھا اُس میں میرے ساتھ اپنی عقیدت مندی کا بہت کچھ اظہار فرمایا گیا تھا لیکن اس پرچے کے پہلے ہی صفحے پر آپ کا پہلا ہی نوٹ شوکت صاحب کی مذمت میں تھا۔ جلد ہی معلوم ہو گیا کہ اس پرچے کی اشاعت کی غرض کیا تھی۔ نواب صاحب بھوپال کے خلاف ہر پرچے میں زہر اگلا جاتا تھا اور ان کے بھتیجے کو ریاست کا حق دار بنایا جاتا تھا۔ چند ماہ بعد آپ نے مجھ سے درخواست کی کہ آپ کا یہ پرچہ میں اپنے پریس میں شائع کیا کروں جس سے میں نے فوراً ہی انکار کر دیا۔ اس کے بعد پرچہ شائع ہونا بند ہو گیا۔ اگر کسی شخص کو یہ حسن ظن ہو کہ جو مضامین آپ کے نام نامی سے یہاں کے اخبارات اور رسالوں میں شائع ہوتے رہتے ہیں وہ آپ ہی کے لکھے ہوئے ہوتے ہیں تو وہ دفتر "کامریڈ" و "ہمدرد" سے THE NEW SPECTATOR کی فائل منگا کر اپنی ضعیف الاعتقادی کی اصلاح کر سکتا ہے۔ خیالات پریشاں اور رکیک، عبارت بے ربط اور ناقص، یہ آپ کی حقیقی قابلیت کے ثبوت میں موجود ہیں۔ اگر اس کے بعد بھی کسی مزید ثبوت درکار ہو تو وہ مئی یا جون ۱۹۲۰ء کی "پایونیر" کی فائل اٹھا کر دیکھ لے جس میں ایک پرچہ میں پڑھنے والے کو پہلے ہی صفحے پر ایک ایڈیٹوریل نوٹ ملے گا جس میں میرے ایک خط کا جو میں نے یہاں سے شوکت صاحب کے نام

لکھا تھا مذاق اڑایا گیا ہے۔ اسی وجہ سے وہ پرچہ میری نظر سے گزرا تھا۔ لیکن اس نوٹ کے بعد ایک اور نوٹ بھی ہے جس میں "سردار" اقبال علی شاہ وسط ایشیا کے EXPERT (ماہر) کے ایک مضمون کے متعلق جو یہاں ایک مصور پرچہ میں مع چند تصاویر کے شائع ہو چکا تھا، درج ہے کہ اس میں جو تصویر دی گئی ہے وہ یقیناً "سردار" صاحب نے اپنے سفر کے ایام میں ہرگز نہیں کھینچی تھی، نہ اُس مقام کی تصویر ہے جس کا سردار صاحب نے ذکر فرمایا ہے، بلکہ اُس سے بہت دور ایک اور مقام کی تصویر ہے، اور ایک انگریز فوجی افسر کی کھینچی ہوئی ہے جو اُس کی ایک تصنیف کردہ کتاب میں شائع ہو چکی ہے، اور اس کے فلاں صفحہ پر موجود ہے" اور ہمارے وسط ایشیا کے محقق ایک سارق سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے! آپ کے اخبار کے بند ہونے کے بعد آپ کی میم صاحبہ ہندوستان سے ولایت کو چل دیں اور اس "جنوری" کے "دسمبر" کی طرح سے

مدالہا سال ہوئے ہیں ترے پیچھے پھرتے

جنوری تو ہے تو اے ماہ دسمبر میں کہیں

آپ نے تعاقب کرنے کی ٹھانی۔ سُنا گیا ہے کہ والد ماجد سے روپیہ کا پھر مطالبہ کیا گیا اور جب اُن غریب نے کہا کہ میرے پاس روپیہ کہاں، تو اُن کو دھمکی دی گئی کہ اگر روپیہ نہیں دیا گیا تو ایک دیوانی کے مقدمے میں فریق ثانی کی طرف سے ان کے خلاف گواہی دے دی جائے گی۔ اس پر ان کے دوستوں نے کہا کہ بھائی کہیں سے قرض دام لیکر دے دو، ورنہ مقدمہ بگڑ جائے گا، چنانچہ کچھ روپیہ اس طرح ملا۔ اس کے بعد بمبئی تشریف لاتے تو حبیب الرحمٰن خاں صاحب (نواب صدر یار جنگ بہادر) جو یقیناً ان کے والد ماجد کو ان کی علی گڑھ کی تحصیل داری کے زمانہ سے جانتے تھے عازم حج نظر آتے۔ پھر کیا تھا؟ آپ نے فرمایا کہ حضرت عجیب بات ہے۔ میں بھی احرام سفر باندھ کر آیا ہوں، مگر جدہ کا ٹکٹ نہیں ملتا۔ انہوں نے فرمایا کہ بھائی ایک ٹکٹ تو میرے

پاس ہے چنانچہ اس بکٹ کو لیکر آپ نے مکہ معظمہ کا قصد فرمایا، اور انہیں کے طفیلیوں
میں آپ "جلالۃ الملک عبد العزیز آل سعود ملک الحجاز و النجد و ملحقاتہا" کے "مہمان" بنے،
اور اُن سے مکہ معظمہ میں ملاقات کی اور ایک دن، جو غالباً پہلا ہی دن تھا، اُن کے
ہمرکاب آپ موتمر عالم اسلام میں بہ طور وزیٹر کے شریک ہوئے۔ یہ باتیں میں نے مکہ معظمہ
میں سنی تھیں، مگر چونکہ میں نے خود تحقیقات نہیں کی ہے، اس لئے نہیں کہہ سکتا کہ کہاں
تک صحیح ہیں۔ مکہ معظمہ پہنچکر آپ ہم سے بھی ملنے آتے وہاں پہلے ہی سے متعدد جواہیں
"دور دور مشہور بر طانیہ" موجود تھے، آپ کو دیکھتے ہی ہم سب بول اُٹھے کہ آہا آپ بھی
تشریف لے آئے۔ آپ ہی کی کسر تھی۔ کم سے کم مکہ معظمہ میں تو نہ انگریزی "ٹوپی" بر سر
تھے اور نہ لباس انگریزی "در بر"۔ غالباً ٹوپی تو ترکی تھی اور ریشم کا لانبا کوٹ تھا اور ٹانگوں
میں شروال۔ لیکن اس بدبخت کی کم نصیبی کو کیا کہا جائے گا جو اس طرح مفت سفر کر کے
بھی حج سے دو دن پہلے جدہ کو چل دے اور وہاں سے عازم یورپ ہو جائے۔

جو "ٹائمز" میں آپ کے مضامین ماجد میاں نے مجھے ارسال فرمائے تھے۔ ان میں سے
ایک مضمون میں ایک عبارت ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ موتمر عالم اسلام کے جلسے
اُس ترکی قلعے میں منعقد ہوئے تھے جو پہاڑ پر واقع ہے، حالانکہ سارے جلسے جیاد کے
میدان والی کشلہ یا ترکی فوجی بارک میں ہوتے تھے جو اس پہاڑ اور قلعے کے نیچے واقع
ہے۔ اس عبارت سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ مضمون کا لکھنے والا کوئی ایسا شخص ہے
جس نے اس قلعے کی تصویر ہی دیکھی ہے اور غلطی سے ترکی کشلہ کو ترکی قلعہ سمجھ گیا ہے اور
خود موتمر میں ہرگز موجود نہ تھا، حالانکہ "سردار" صاحب یقیناً ایک دن ضرور وزیٹر کی حیثیت
سے شریک ہوتے تھے یعنی نام تو آپ کا تھا، مگر کام کسی انگریز کا تھا، آپ کا کام صرف اس
قدر تھا کہ شوکت علی محمد علی کے خلاف چند جھوٹی باتیں دل سے گھڑ کر دشمنان اسلام اور
دشمنان ہندوستان کے ہاتھ آپ نے فروخت فرمادی تھیں۔ اس موتمر کے بعد آپ کے

نام سے شائع کر دیئے گئے ہوں گے تو بیس پچیس مضامین شائع کر دیئے گئے ہوں گے اور اس کے بعد آپ کا ایک لکچر ساؤتھ فیلڈ کی اس قادیانی مسجد میں زیر صدارت سر مائیکل اوڈوائر سابق لفٹننٹ گورنر پنجاب دلوایا گیا جس کے افتتاح کا وعدہ کر کے شہزادہ فیصل ابن عبدالعزیز آل سعود نے بالآخر انکار کر دیا تھا، اور جس کے لئے قادیان سے میرے پاس ایک تار آیا تھا کہ میں سلطان ابن سعود کو پھر آمادہ کروں کہ اپنے صاحبزادہ کو اس مسجد کے افتتاح کی اجازت دے دیں۔ مضامین اور لکچر دونوں ملی برادران کی مذمت سے بھرے ہوئے تھے۔ لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب مجھے اس مکان کی مالکہ صاحبہ نے سب سے اوپر کی منزل سے سب سے نیچے کی منزل میں یہ کہلوا کر طلب فرمایا کہ ایک صاحب آپ سے ٹیلیفون پر بات کرنا چاہتے ہیں اور اُن صاحب نے فرمایا کہ میرا نام اقبال علی شاہ ہے ٹیلیفون پر جو مکالمہ ہوا اب اُسے سنیئے :-

"سردار" اقبال علی شاہ - مولانا السلام علیکم - معاف فرمایئے گا۔ میں نے آپ کو تکلیف دی۔

محمد علی :- وعلیکم السلام۔

س - ا - ع - ش - مجھے اس کا علم نہ تھا کہ آپ کو اوپر سے نیچے آنا پڑے گا۔ میں سمجھتا تھا کہ ٹیلیفون آپ ہی کے کمرے میں ہے۔

م - ع - ارشاد فرمایئے۔

"س" ا - ع - ش - فرمایئے آپ کا مزاج تو اچھا ہے

م - ع - جی نہیں۔

"س" - ا - ع - ش - امید ہے کہ آپ نے میرا قصور معاف فرما دیا ہوگا۔

م - ع - جی نہیں۔

"س" - ا - ع - ش - آپ کا قلب تو نہایت وسیع ہے

م ۔ ع ۔ مگر میرا دماغ بالکل تنگ نہیں ہے ۔

س ۔ ا ۔ ع ۔ ش ۔ کیا میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو سکتا ہوں ۔

م ۔ ع ۔ جی نہیں ۔

س ۔ ا ۔ ع ۔ ش ۔ میں تو پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ امید ہے کہ آپ نے میرا قصور معاف کر دیا ہو گا ۔

م ۔ ع ۔ اور میں بھی پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ جی نہیں ۔

اس کے بعد میں نے ان ذات شریف کو ان کے تمام مضامین یاد دلائے اور اُن کا لکچر یاد دلایا ۔ اور کہا کہ میں تنگ دل نہیں ، لیکن اس قدر ضعیف الدماغ بھی نہیں ہوں کہ ایسے پاجیوں سے دھوکا کھاؤں ۔ مجھے تعجب ہے کہ برطانیہ کے ایسے گرگوں کو جو اس کی طرف سے ایسے گندے کام اور جاسوسی کرتے پھرتے ہیں ۔ کیسے اتنی ہمت ہوتی کہ مجھ سے ٹیلیفون پر گفتگو کریں اور مجھ سے ملاقات کرنا چاہیں ۔ میں نے کہا کہ اب اس سلسلہ کو ختم ہونا چاہیئے اور میں نے ٹیلیفون کو فوراً منقطع کر دیا ۔

اب اس خط کو بھی اسی خاتمہ بالخیر پر ختم کرنا چاہتا ہوں ورنہ بے چاری بیگم صاحبہ کے نام دو سطریں نہ لکھ سکونگا ۔ مہاراجہ پٹیالہ کا لکچر اور ٹیکسی والے کی میرے ساتھ گستاخی اور اس کا ثمرہ اور اس ثمرے کا جو ثمرہ بنگالی طالب علم کو اور مجھے چکھنا پڑا وہ داستان اس ہفتے ملتوی رہی ۔ انشاءاللہ کل پرسوں اُسے لکھ رکھونگا ۔ تاکہ اگلے ہفتے ضرور بضرور آپ تک جا سکے ۔

" ہمدرد " کی اشاعت کے متعلق کوئی صاحب کچھ نہیں تحریر فرماتے ۔ پرچہ ماشاءاللہ خوب نکل رہا ہے ۔ آخر پنج ظفر الملک صاحب کی ہمت سے گھٹ گیا ہے اور اس پر بھی دس صفحے نکل رہے ہیں اور بارہ کا ارادہ ہے ، خدا اجر خیر عطا فرمائے ۔ مگر یہ تو بتایئے کہ قدر دانی میں کس قدر اضافہ ہوا ۔ اب آپ صاحبوں اور " ہمدرد " اور اسلام اور ہندوستان کے لئے دعا پر اس عریضے

کو ختم کرتا ہوں۔

آپ کا بھائی

محمد علی

گزشتہ جمعرات کو (یعنی ۲۔ اگست کو) میں دار العوام گیا تھا۔ جمعہ کو دار العوام کا آخری اجلاس تھا، اور سکلات والا کے پیہم اعتراضوں اور سوالوں پر لیبر پارٹی نے محض نام کیواسطے بحث کے سلسلہ میں ہندوستان کا مسئلہ بھی چھیڑا۔ صرف دو گھنٹے ایک شب کو ہندوستان کے ۳۲ کروڑ انسانوں کے لئے بھی وقف کئے گئے۔ مگر وہ بھی آخری اجلاس میں، اور کنزرویٹیو فرقہ والوں نے عمداً کنیڈا کو انگریزی مزدور بھیجنے کے سلسلے میں فضول تقریریں کرکے، اور وزیر محکمہ کے جواب کے بعد بھی تقریر کے سلسلہ کو جاری رکھ کر، اور خلاف انتظام طے شدہ یہاں کے سابق سپاہیوں کی سول سروس میں نوکری کے مسئلہ کو بھی اٹھا کر اتنی دیر لگادی کہ ہندوستان کا ذکرِ خیر بجائے ۹ بجے شب کے ساڑھے دس بجے شروع ہوا اور ½۱۲ پر ختم ہوگیا۔ رات کے بارہ بجے تک کی کارروائی اخبار ڈیلی ٹیلیگراف کی فائل کیساتھ بھیج دی ہے اور باقی کارروائی یوسف حسین خاں (برادر ذاکر صاحب جو آج کل میرے ہمراہ اسی مکان میں مقیم ہیں) خرید کر کے غالباً آج ہی آپ کو روانہ کردیں گے سکلات والے کی تقریر بے مثل تھی! اور ارل ونٹرٹن نے اسی میں مصلحت سمجھی کہ اس کا مطلق جواب نہ دیں۔ کل مباحثہ کا حال انشاء اللہ اگلے ہفتے ارسال کروں گا۔

محمد علی

(۱۴)

تہذیب یورپ کے چند مناظر

راہی ملک جرمنی
۱۶۔ اگست ۱۹۲۸ء

پیارے ماجد میاں ظفر الملک صاحب اور جعفری السلام علیکم ورحمتہ اللہ۔
میں ۱۳۔ اگست کی شب کو لندن سے نکلا ہوں اور دو دن پیرس قیام کر کے آج "تین بچا بچیج" کے ساتھ جرمنی جا رہا ہوں جن میں سے دو دو صاحبین ہیں جن کیساتھ میں لندن کے مکان میں رہا کرتا تھا اور ایک عبد الرحمن صاحب صدیقی کے بھانجے محمد امین فقیہہ صاحب کے صاحبزادہ جو ہمارے فرانس کی حدود میں ترجمان اور سارے عالم میں ہمارے خزانچی ہیں۔ خالد صاحب ۹ رجولائی ہی سے اپنے والد کے ایک دوست کے ترجمان اور رفیق سفر بنکر لندن سے نکلے تھے اور ان چچا جان کو "مارسیلز" تک پہنچا آئے تھے۔ اس کے بعد جب شوکت عمر صاحب "برسی پالٹیکنیک" سے جہاں وہ ۷۔ ۸ ماہ سے پڑھ رہے تھے، کامیاب ہو کر لندن یونیورسٹی کے سیکنڈ ایر میں داخل ہو گئے۔ اور ان کے ساتھی اشرف صاحب کو لندن کاٹنے لگا۔ اور ہمیں ڈاکٹر ذاکر حسین کے بھائی یوسف کیساتھ چھوڑ کر جو پیرس کی ساربون یونیورسٹی سے دفتر وزیر ہند اور برٹش میوزیم میں مطالعہ کرنے آئے ہیں، پہلی اگست کو پیرس چلے آئے تھے۔ میرا ارادہ تھا کہ پہلی ستمبر تک لندن رہ کر کرنل آسٹن سے علاج کراتا رہوں اور اس کے بعد فرانس آجاؤں اور بالآخر ایک ہفتہ اٹلی رہ کر عازم ہندوستان ہو جاؤں۔ البتہ راستہ میں ایک ہفتہ شہر مصر میں بھی قیام کروں اور اگر کچھ پیسے بچ سکیں تو فلسطین بھی ہوتا آؤں۔ لیکن اگست کا مہینہ لندن والوں کے لئے چھٹی کا مہینہ ہوتا ہے اور غریب امیر مرد اور عورتیں اور بچے

دو تین دن سے لیکر دو ماہ تک کے لئے لندن سے باہر سمندر کے کنارے یا کسی اور تفریح گاہ کو چلے جاتے ہیں چنانچہ کرنل آسٹن صاحب بھی ۱۱۔ اگست سے ۱۰ دن کے لئے انگلستان کے مشہور اور قدیم جنگل نیوفارسیٹ میں چلے گئے ہیں یہاں ووکنگ کے امام صاحب نے اصرار فرمایا کہ عید میلاد کے جلسہ تک جو ۸ ستمبر کو ہونیوالا ہے لندن میں قیام کروں، اور اس جلسہ میں ایک تقریر کرنے کے بعد انگلستان سے رخصت ہوں۔ جب میں قاہرہ گیا تھا تو ڈاکٹر احمد فواد نے سخت اصرار کیا تھا کہ یورپ چھوڑنے سے پیشتر جرمنی کے مشہور شہر فرنکفرٹ کے ذیابطیس کے ماہر ڈاکٹر پروفیسر فان نارڈن کو بھی اپنا حال سُناتا آؤں اور گو میں کہہ چکا تھا کہ میں علاج صرف کرنل آسٹن کا کروں گا۔ لیکن ان کے اصرار پر اس کا وعدہ کر چکا تھا کہ ان سے اپنا طبی معائنہ ضرور کرالوں گا۔ تاکہ معلوم ہو جائے کہ کرنل آسٹن کے علاج کے بعد اب حالت کیسی ہے۔ اسلئے گذشتہ ہفتہ میں ایک دن جاکر اپنے پاسپورٹ کی بلجیم" جرمنی اور ہالینڈ کے لئے بھی توسیع کرالایا۔

عجیب حسن اتفاق ہے کہ دوسرے ہی دن جرمنی سے چنٹو پدھیا صاحب مسٹر نیڈو کی بھائی کی دعوت بھی آئی۔ میں ان کا دعوت نامہ اور اس پر میں نے جو جواب لکھا تھا۔ دونوں ملفوف کئے دیتا ہوں جس سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ دعوت کس قسم کی تھی اور میں نے اس کا کیا جواب دیا۔ مجھے اس وقت ترجمہ کرنے کی فرصت نہیں ہے۔ آپ حضرات خود ترجمہ کر سکتے ہیں ورنہ میں نے اس کا خلاصہ اس خط میں دیدیا ہوتا میں ادھر ہی کو روانہ ہو گیا ہوتا مگر بیگم صاحبہ کو جو تار گذشتہ بدھ کو دیا تھا اس کے جواب کا پیر تک انتظار تھا۔ گو گذشتہ ہفتہ کے تار کا جواب نہ آنے سے تقریباً مایوسی ہو چکی تھی اور میں نے یہ یقین کر لیا تھا کہ وہ میجر سعید محمد خان کے ساتھ جو بھوپال سے ۱۴ اگست کے جہاز میں روانہ ہو رہے ہیں، معہ لڑکیوں کے نہیں آرہی ہیں۔ ۱۳ اگست کو ان کا جواب بھی آگیا کہ

روپیہ کا کوئی بندوبست نہیں ہوسکا اور میں نے حمیدہ بی کو خدا پر چھوڑ کر خود جرمنی جانے کے لئے رخت سفر باندھنا شروع کیا۔ تھوڑی دیر میں چوہدری صاحب کا تار بھی برلن سے آ گیا کہ سب انتظامات کر دیئے گئے۔ چنانچہ وقت بچانے کے لئے اسی شب کی گاڑی میں یوسف صاحب سے رخصت ہو کر روانہ ہو گیا۔ یہ راستہ ساؤتھمپٹن اور ہاورے ہو کر آتا ہے اور چینل (رود بار انگلستان) کے عبور کرنے میں ۶ گھنٹے لگتے ہیں۔ یہ عام طور پر لوگ اس سے گھبراتے ہیں۔ لیکن وقت کی بچت ہوتی ہے۔ اسلئے کہ رات کو ڈوور کیلے ہو کر اور فاک اسٹون بولون ہو کر سفر کیا جا سکتا ہے۔ راستہ میں بڑی خیر ہو گئی۔ ساؤتھمپٹن کے اسٹیشن پر کوئی قلی نہ ملا اسلئے اپنے ہینڈ بیگ وغیرہ اور سوٹ اٹھا کر میں بھی اور مسافروں کے پیچھے ہو لیا اور انہیں کے ساتھ ایک کشتی پر سوار ہو گیا اگر جاتے ہی سونے کے لئے کیبن نہ مانگا جاتا تو بجائے فرانس کے میں جزائر چینیل پہنچ گیا ہوتا۔ جب میں نے کشتی پر سوار ہو جانے کے بعد اپنا ٹکٹ کمرہ لینے کیلئے دکھایا تو پتہ چلا کہ

ترسم نہ رسی بکعبہ اے اعرابی
کیں راکہ تو میروی بترکستان است

فوراً اتر کر اس طرف گیا جہاں ایک دوسری کشتی، فرانس جانے کے کھڑی تھی۔ غریب فرانسیسی مزدوروں کو تو ۵ فرانک مزدوری کے مل جاتے ہیں تو اسے غنیمت سمجھتے ہیں۔ لیکن یہاں کے قلیوں کے لئے ۲ شلنگ بھی مشکل سے کافی ہوتے ہیں اور استغنا کا یہ عالم ہے کہ مسافروں کی طرف بہت کم توجہ کرتے ہیں۔ رہے ٹیکسی والے تو اس جماعت میں تو ایسے خبیث بھرے ہوئے ہیں کہ کچھ ٹھکانا نہیں۔ ساری دنیا سے زیادہ بھاری، سست اور سڑیل ٹیکسیاں لندن کی ہیں لیکن کرایہ پیرس کی عمدہ ترین ٹیکسیوں سے بھی تگنا چوگنا ہے اور انعام بطور انعام کے قبول نہیں کیا جاتا، بلکہ حق سے بھی زیادہ

سمجھا جاتا ہے اور اگر خوردہ لینا پڑتا ہے تو بڑے اصرار کے بعد ملتا ہے۔ ورنہ ایک شلنگ
کا ڈیڑھ شلنگ کرایہ ہو اور ۲ ½ شلنگ دیا جائے تو ٹوپی چھو کر جیب میں رکھ لیتے ہیں
اور نہایت اطمینان سے رخصت ہونا چاہتے ہیں۔ ان ٹیکسی والوں کے متعلق انشاء اللہ
آئندہ کسی خط میں تفصیل سے لکھوں گا اور وہ سارا قصہ دہراؤں گا جو مجھے پیش آیا تھا۔
اور جس کی بدولت لندن کے ایک پرجوش بنگالی طالب علم کو، ٹیکسی والے کو دو پونڈ بطور
خرچہ دینے کم پڑے تھے اور مجھے ان کی حمایت کرنے والے سولسٹر اور بیرسٹروں کو ان
کے گھنٹہ بھر کی محنت کے لئے ۵ پونڈ ۷ شلنگ ۶ پنس دینا پڑے تھے۔ ۱۴ کو پیرس پہنچکر
اسی وقت راہی فرانکفرٹ ہو گیا ہوتا، مگر چٹوپادھیا صاحب کا خط جس کے متعلق ان کا
تار آیا تھا کہ اس میں ہدایات سفر ارسال کئے گئے ہیں۔ مجھے اس دن ٹامس کک
کے یہاں سے نہ مل سکا۔ اس کے علاوہ "بچا چیچ" کو سین ژرمین کی سیر کرانے گیا تھا۔
واپسی میں یکایک داہنے پاؤں میں درد شروع ہوا۔ اور راسی کے باعث شبکو حرارت
ہو گئی۔ درد کل بھی رہا اور آج بھی باقی ہے اور قیاس یہی ہے کہ یہ سب ذیابطیس اور
نیورائیٹس کی علامت ہے۔ چنانچہ آج شبکو فرانکفرٹ پہنچکر کل صبح کو پیر بھی دکھاؤں گا۔ میری
صحت کی عام حالت اچھی ہے۔ پچھلے فاقہ کے بعد ایک ہفتہ تک میں نے گوشت نہیں
کھایا، بلکہ محض پھلوں اور بغیر پکی ہوئی ترکاریوں پر یعنی کھیرا، ککڑی، ولائتی بینگن ادرکا ہو
پر گذر کیا تھا۔ قارورہ کا امتحان کرایا تو شکر نصف فیصدی تھی اور چربی ۱/۱۰۰ فیصدی تھی۔ فاقہ
کرنے کے بعد شکر بالکل نہ تھی اور چربی ۳/۱۰۰ فیصدی تھی۔ وزن مخصوصہ ۱۰۲۴ سے بڑھکر
۱۰۲۶ ہو گیا تھا۔ وزن تو نہیں بڑھا تھا صرف چھ چھٹانک کی زیادتی ہوئی تھی مگر خلاف
توقع کمر ۱۲۔ انچہ بڑھ گئی تھی اور پاؤں کے تلووں میں اعصابی سوزش پھر کسی قدر شروع
ہو گئی تھی، اسلئے میں نے پھر ڈاکٹر گالیا کے دستور کے مطابق سفر میں فاقہ شروع کر
دیا اور آج فاقہ کا چوتھا دن ہے۔ البتہ جس شب کو بخار آیا تھا اور سردی محسوس ہونے کے

باعث نزکاری کا شور رہا بچا چیچ تیار کرالاتے تھے، وہ پی لیا تھا مگر صبح ہی کو فروٹ سالٹ کا ایک مسہل اور لے لیا۔ رات اور پرسوں رات بھی بائیں پاؤں میں اعصابی سوزش ہوئی تھی۔اس سے کچھ امید بھی بندھتی ہے کہ مرض کا فاتوں سے مقابلہ ہو رہا ہے۔ اور سہر میت اُٹھانے سے پہلے مرض زور دکھا رہا ہے۔

میرا ارادہ تھا کہ کل آپ کو خط لکھتا مگر اس درد کے باعث نہ لکھ سکا اور بجائے اس کے خالد کو ساتھ لیکر بیلیس نامی ہیوزک ہال دیکھنے چلا گیا۔ برادران منؔ! اب تو مدت سے کسی محفل رقص و سرود میں شریک نہیں ہوتا ہوں اور باوجود نفس امارہ کے بہت سے مطالبات کے انہیں پورا کرنے سے باز رہتا ہوں۔ انہیں کیفیات قلبی کو ایک شعر میں اس طرح ادا کیا تھا ؎

یکبارگی ہوس کے چھٹے سارے مشغلے
لے دل نگاہ یار کیسا سحر کر گئی

ہندوستانی گانا سننے کو البتہ اب بھی دل تڑپا کرتا ہے اور شوکت صاحب نے تو ایک دو بار نفس کو بہت ہی لالچ دلایا۔ اس لئے کہ گوہر جان کی طرف سے وہ دعوت لائے تھے کہ کبھی کبھی تو گھر آکر کچھ سن لیا کیجئے۔ میں قسم کھاتی ہوں کہ سوائے اقبال کے اشعار کے اور حسرت کی غزلوں کے آپ کو کچھ اور نہ سناؤں گی۔ لیکن میں نے ضبط و صبر سے کام لیا اور کہلا بھیجا کہ اب تو معذور ہوں۔ البتہ جب کبھی کلکتہ جاتا ہوں تو پیارے صاحب کا گانا ضرور سن لیا کرتا ہوں اور "جنت نگاہ" نہ سہی "فردوس گوش" تو ضرور نصیب ہو جایا کرتی ہے۔ مہاراجہ الور کے ہمرکاب رامپور گیا تھا تو پہلی شب کو جب میں محفل رقص و سرود میں حاضر نہ ہوا تھا تو بلوایا گیا تھا مگر جب میں نے عذر پیش کر دیا۔ تو مہاراجہ صاحب نے اسے قبول نہ فرمایا، بلکہ خود بھی اس کے بعد محفل رقص و سرود میں شریک نہ ہوئے۔ اور اس کے عوض قوالی کی محفل اپنی قیامگاہ کے پاس ہی ہر شب کو منعقد کرائی۔ ہندوستان

ہیں جو تھیٹروں کی حالت ہے وہ آپکو معلوم ہے سینما میں بھی اکثر سوائے بوس و کنار کی تعداد یر کے کچھ نہیں ہوتا اسلئے میں سینما میں نہیں جایا کرتا اور بچا چیچ "کو یہ سن کر سخت تعجب ہوا کہ میں نے آج تک چارلی چپلن کو سینما میں نہیں دیکھا اور گذشتہ ہفتہ ہی میں اپنے محلہ کے ایک سینما میں ان کے فلم پروگرام میں دیکھتے ہی بس پر سے اتر پڑا حالانکہ ٹکٹ بچاولی کے لئے تھا تاکہ وہاں جاکر ایک تھیٹر میں سینما دیکھیں۔ البتہ میں سنجیدہ ڈراما کا عاشق ہوں اور ایلن ٹری جو ابھی انتقال کر گئی ہے اور اورنگ بیر بوہبورا اور ٹری اور مسز ٹری فاربس رابرٹس اور مسز پیٹرک اور پھر ان کی بیوی گرٹروڈ ایلمنٹ ولسن بیرٹ اور نانڈ چیفریز اور پھر لیلا میک کارتھی وغیرہ کو اکسفرڈ کی تعطیلات میں دیکھنے کیلئے بار بار تھیٹر جایا کرتا تھا۔ ۱۹۱۳ء میں جب آیا تھا تو مطلق فرصت نہ تھی۔ پھر بھی برنارڈ شا صاحب کے ایک تماشہ کو دو بار جاکر دیکھا۔ لیکن اب وہ بڑے بڑے ایکٹر باقی نہ رہے تھے۔ ۱۹۲۰ء میں تو اتنی بھی فرصت نہ تھی جتنی کہ ۱۹۱۳ء میں تھی اور حقیقت میں دل بھی اب اس ڈراما میں لگا ہوا تھا جس میں مصطفےٰ کمال پاشا اور ان کے ساتھی اناطولیہ میں ایکٹ کر رہے تھے۔ البتہ اس بار ذرا فرصت تھی اور ہنڈن میں طیاروں کے کرتب دیکھنے کے بعد شفیع کی رسٹوران میں ہندوستانی کھانا کھاکر تھیٹروں کی طرف رُخ کیا۔ مگر کہیں جگہ نہ ملی۔ "بچا چیچ" کے اصرار سے ہوبرن کے امپائر نامی میوزک ہال میں گیا اور بالکل خیال نہ رہا کہ یہاں تو محفل رقص و سرود گرم ہوتی ہوگی۔ جب وہاں پہنچ چکا تو میری آنکھوں نے پہلی بار تھیٹر میں وہ نظارہ دیکھا جو کبھی جوانی میں بھی نہ دیکھا تھا، یعنی چند عورتیں ٹخنوں سے لیکر رانوں تک برہنہ ہمارے یہاں کی کبوتریوں کی طرح کرتب دکھا رہی ہیں۔ جب میں تیس برس پیشتر انگلستان آیا تھا تو میوزک ہال میں ہر رقاصہ ریشم کے ٹائٹ یعنی رانوں تک موزے پہنے ہوتی تھی، پھر بھی ایسے رقص گاہوں میں جانا "رنگیلے پن" کی علامت تھی۔ لیکن اب تھیٹروں میں برہنگی کیوں نہ آتے، جب سمندر کے کنارے ہر تفریح گاہ میں

ہزاروں عورتیں مردوں کی طرح سے بنیان کا جانگیا پہنے انہیں کیسا تھ تیرتی پھرتی ہیں اور اس کا نظارہ گو اب تک میں نے کسی بندرگاہ پر جاکر نہیں کیا ہے۔ تاہم اپنے جہاز ہی پر ولایت آتے وقت دو تین میم صاحبان کو تنق پر کرچ کی حوض میں کودتے پھاندتے اور مردوں کی گردنوں پر سوار ہوتے دیکھ چکا تھا۔ آجکل ہر مصور اخبار میں ان ہزارہا "غسالجات" کے حسن کی نمائش اور اس کا مقابلہ ہو رہا ہے۔ چنانچہ میں ہر ہفتہ چند پرچے مولانا عرفان کی خدمت میں بھیجدیا کرتا ہوں کہ وہ سمجھ سکیں کہ اب نوبت کہاں تک پہونچ گئی ہے۔

برادران من! حقیقت میں اب پردہ یہاں تک اُٹھ چکا ہے کہ شب عروسی بھی بے نقاب نظر آتی ہے۔ جب انگلستان کا یہ حال ہو جہاں میری طالب علمی کے زمانہ میں عورتوں اور مردوں کا ساتھ ساتھ نہانا قطعاً ممنوع تھا حالانکہ اس زمانہ میں عورتوں کا سارا جسم ڈھکا ہوتا تھا تو پھر آجکل پیرس میں کیا کچھ نہ ہوتا ہوگا۔ جب میں نے "بیچا پیچ" سے سُنا کہ وہ مولاں اوڑ فولی برژیر جاکر اس عریانی کا نظارہ کر چکے ہیں تو میں نے بھی محض اس خیال سے کہ

کہ سالک بے خبر نہ بود نہ راہ و رسم منزلہا

فیصلہ کیا کہ پیلس جاکر دیکھوں تو کیا کچھ نظر آتا ہے۔ اس سے پہلے "پاری پلنیر" نامی ایک رسالہ میں متعدد تصاویر دیکھ چکا تھا جس میں دو سماتیں "حمیدہ" اور "ڈھلی" نامی بھی تھیں ان کا لباس دیکھ کر مجھے اس امریکن عورت کا قول یاد آیا جس نے لکھا تھا کہ "ہاں میں جانتی ہوں کہ ہندوستان کا قومی لباس کیا ہے۔ ہندوستان کا قومی لباس ایک ٹپکا اور ایک جیبی رومال ہے"۔ ان غیر مستورات کے سر پر بھی ایک ٹپکا تھا اور باقی جسم کے لئے ایک نہایت مختصر سا جیبی رومال رہ گیا تھا۔ اس رومال کو رومالی کی جگہ دیکھ کر بے اختیار غالب کے اس شعر میں تصرف کرنے

کو جی چاہتا تھا ؎

ہائے اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ
جس کی قسمت میں ہو معشوق کی خشقت ہونا

میں نہیں کہہ سکتا کہ خشقت کے معنے کیا ہیں آجتک کبھی لکھنے کا اتفاق ہی نہیں ہوا۔ مجھے تو یہ خیال تھا کہ یہ ہمارے روہیلکھنڈ والوں کی پشتو کا ایک لفظ ہے اور رخ ن اور ش ت کا اجتماع یقیناً "پختو" پر دلالت کرتا ہے لیکن "بچاچیخ" نے تصدیق کر دی کہ یہ لفظ مستعمل عام ہے ملکہ پیش پا افتادہ ہے جس کا انگریزی ترجمہ شاید یہ ہوگا WORNTHREAD BARE. جو کچھ میں نے دیکھا اس کے صرف ایک حصہ کی تصاویر آپ کی خدمت میں ارسال کرتا ہوں۔ اگر ان کے بلاک بھی مل جاتے تب بھی "ہمدرد" میں یہ تصاویر شائع نہ ہو سکتیں، گو ایک بار شائع ہو جائیں تو یقیناً "ہمدرد" کی اشاعت "زمیندار" اور "انقلاب" سے بڑھ جائے اور ایک مجرد بے ریشے مؤلف کے تجربات "شب عروسی" وغیرہ کو بھی مات کر دے۔

اب میں اس خط کا بھی خاتمہ بالخیر کرتا ہوں۔ ہم سیلان سے جو فرانس کا ابلڈر شاٹ یا راولپنڈی ہے گذر چکے ہیں، اور اب نیلیسی سے گذر رہے ہیں جو واسے نسے پہاڑوں کے سلسلہ کے پیچھے فرانس کے مدافعتی خط کے وسط میں ہے۔ ممکن ہے کہ اگلا خط اتنا لمبا بھی نہ ہو سکے اس لئے کہ اس دن میں انگلستان کو واپس ہو رہا ہونگا۔ گذشتہ ہفتہ میں ارادہ کر چکا تھا کہ جمعہ کے بعد ہی آپ کو خط لکھنا شروع کر دوں گا۔ لیکن نماز جمعہ کے بعد نماز گاہ میں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ جماعت سے مذہبی مکالمہ کیا کرتا ہوں اور اس کے بعد آرنلڈ صاحب سے ملنے گیا اور وہاں سے قادیانی جماعت کے ساتھ شب کا کھانا کھانے گیا مگر صرف دعوت ہی نہیں

تھی بلکہ ایک پورا استقبال ہوگیا۔ ایک نومسلم آئرش نے ایڈریس پڑھکر سنایا۔ اور مجھے بھی تقریر کرنا پڑی اور وہاں کے امام شائق درد صاحب نے بھی تقریر کی اور دوسرے دن انہیں نومسلم آئرش مین صاحب کے ساتھ انکی موٹر میں لندن سے ۳۰۔ ۴۰ میل باہر ان کے دوست اور اپنے واقفکار ایک انگریز نومسلم صاحب سے ملنے جانا پڑا جو نیاسالینڈ (افریقہ) میں سرکاری ڈاکٹر ہیں۔ ان کا نام ڈاکٹر ساندرسن ہے اور حج بیت اللہ میں ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ ان کو ہم نے تار دے دیا تھا، مگر افسوس کہ وہ تار ملنے سے پہلے ہی کہیں باہر جا چکے تھے۔ یہ نیاسالینڈ کی زبان کے حروف تیار کر رہے ہیں تاکہ عربی رسم الخط میں حروف کا اضافہ کرکے قرآن کریم کا اس زبان میں ترجمہ ٹائپ میں شائع کر دیا جائے انشاء اللہ واپسی پر ان سے پھر ملنے ضرور جاؤنگا۔ اس سفر کے باعث خط جمعرات سے پیشتر اس بار بھی شروع نہ کیا جاسکا اور جتنا لکھا گیا ہے اسکے لئے آپ کو اشرف صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہئے جنہوں نے اب تک سوکھی روٹی بھی نہیں کھائی ہے چونکہ "بچا جیج" کو سیر و تفریح کے لئے علیحدہ روپیہ نہیں ملا ہے اس لئے میرے طریقہ علاج پر عمل کرکے وہ صرف ایک وقت سوکھی کھاتے اور پیٹ کاٹ کر سفر کرتے ہیں اور نیپولین کے مشہور مقولہ پر کہ "فوج پیٹ کے بل چلا کرتی ہے" ایک دوسرے معنی میں عمل کر رہے ہیں۔ فی امان اللہ۔

آپ کا بھائی محمد علی

(۱۵)

ایک جلاوطن ہندوستانی سے مُلاقات

میرے پیارے مسٹر چٹوپدھیا[1]

آپ کے برلن کے دفتر سے بھیجا ہوا ۷ اگست کا خط جس پر میرا پتہ صرف "مولانا صاحب کیونڈش روڈ الخ" لکھا ہوا تھا۔ مجھے آج ہی ملا ہے۔ اس خط میں مجھے اطلاع دی گئی تھی۔ کہ آپ نے چند ہی روز پیشتر مجھے ایک خط "مولانا صاحب معرفت ٹامس کک کمپنی" کے پتہ سے بھیجا تھا اور مجھ سے درخواست کی گئی تھی کہ میں وہاں اس خط کو منگاؤں۔ بہر حال خوش قسمتی سے دونوں خط کہ جن پر محمد علی کا نام بھی پتہ پر نہ تھا ضائع نہ ہوئے اور جب میں نے ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کے بھائی کو، جو یہاں میرے ساتھ رہتے ہیں کک کمپنی میں بھیجکر خط کو مجھ تک پہنچا دینے کی درخواست کی تو انہوں نے فوراً بھیج دیا اور مجھے آپ کا اپنا بھیجا ہوا خط جس پر تیسری اگست کی تاریخ تھی اور برلن سے بھیجا گیا تھا آج شام کی ڈاک سے مل گیا۔

اچھا اب آپ اپنی محبت آمیز دعوت کے متعلق بھی سُن لیجئے۔ اصل یہ ہے کہ اس مرتبہ میں یورپ کوئی اپنے خرچ سے نہیں آیا ہوں اور نہ کسی خاص غرض سے بھیجا گیا ہوں بلکہ ایک فیاض رئیس ہز ہائینس مہاراجہ الور نے جب یہ دیکھا کہ میں مر رہا ہوں تو انہیں مجھ پر ترس آیا اور انہوں نے مجھے مجبور کیا کہ یہاں آکر ویمبل اسٹریٹ میں اُن کے ڈاکٹر سے علاج کراؤں جو اگرچہ شاہی فوجی طبی جماعت سے تعلق نہیں رکھتے تھے لیکن اس طریقہ علاج

[1] ہندوستان کے ایک انتہا پسند سیاسی رہنما۔ آپ عرصہ دراز سے جلاوطن ہیں۔ پیشتر قیام جرمنی اور روس میں رہا۔ آپ مسز سروجنی نائیڈو کے بھائی ہیں۔

پر اعتقاد نہ رکھنے کے باعث اب قدرتی طریقوں پر امراض کا علاج کیا کرتے ہیں۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ مہاراجہ صاحب کی جانب سے مجھ پر کسی قسم کی پابندیاں عائد نہیں کی گئی تھیں اور حق یہ ہے کہ اگر ایسی کچھ پابندیاں عائد کی جاتیں تو میں شکریہ کے ساتھ اُن کی فیاضانہ امداد کی قبولیت سے انکار بھی کر دیتا، تاہم میں خود محسوس کرتا ہوں کہ یہاں مجھے کوئی ایسی بات نہ کرنی چاہیئے جو میں ہندوستان میں رہ کر نہ کر سکوں اور اس مرتبہ اپنی یورپ کی سیاحت سے کوئی سیاسی فائدہ حاصل نہ کرنا چاہیئے۔ اور حق یہ ہے کہ مجھے اس بات کا یقین بھی نہیں ہے کہ ہم ہندوستانی لوگ اپنی یورپ کی سیاحت سے کسی قسم کا سیاسی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ہمارے عمل کا مناسب میدان ہندوستان ہی میں ہے اور صرف وہی جگہ ہے۔ جہاں سے آزادئ اسلام اور آزادئ ہند کے متعلق اپنا کام کر سکتا ہوں۔ اس لئے میں سوائے اپنے ہی آدمیوں کے جلسوں کے اور جلسوں میں شریک نہیں ہوتا اور نہ اخبارات ہی کے لئے کچھ لکھا کرتا ہوں۔ نہ ملاقات پر بیانات دیا کرتا ہوں۔ لیکن اگر کوئی شخص میرے خیالات معلوم کرنے کا خواہشمند ہو تو خواہ وہ ملکیت پسند ہو یا ملکیت کا مخالف، قدامت پسند ہو یا اشتراکی یا اشتمالی غرضیکہ کوئی ہو میں انکار نہیں کیا کرتا۔ یہی میں نے اپنے محب قدیم مسٹر سکلتوالا سے بھی کہ دیا تھا۔ جب اُنہوں نے مجھے گورہال کے ایک عام جلسہ میں شرکت کی دعوت دی تھی۔

اچھا اب یہ سنیئے کہ میں آپ سے نیاز حاصل کرنے کا بے حد مشتاق تھا۔ کچھ تو اس وقعت کی وجہ سے جو آپ کی ذاتِ گرامی کی میرے دل میں ہے۔ اور کچھ اس لئے کہ آپ میری عزیز دوست سروجنی کے بھائی اور اُن کی پیاری بچی پدمیا (جس کی دوبارہ علالت کی خبریں میں نے ابھی ہندوستان سے آئے ہوئے اخبارات میں پڑھی ہے) اور میری اپنی آکسفورڈ کی بہن "شاک ہیڈ بد ہیٹر" کے ماموں ہیں۔ لیکن میں حیرت میں تھا کہ آپ سے کس طرح مل سکونگا۔ کیونکہ جرمنی جانے کا میرا قطعاً ارادہ نہ تھا اور اپنے پروانۂ راہداری پر صرف فرانس، سوئیٹزرلینڈ کے نام لکھا کر لایا تھا یا اطالیہ کا، جہاں ہندوستان کو واپس ہوتے ہوئے راستہ میں جانے کا ارادہ

تھا۔ قاہرہ میں میرے ایک ڈاکٹر دوست نے مجھ سے تاکید کر دی تھی کہ میں فرینکفرٹ کے ڈاکٹر نارڈین سے ضرور ملوں۔ اسی لئے جب اس دن میرے موجودہ معالج نے مجھ سے یہ ذکر کیا کہ وہ ۱۱ تاریخ کو لندن سے باہر جانے والے ہیں اور ۱۲ سے پہلے واپس نہ آئینگے۔ تو میں نے بھی سوچا کہ لاؤ اپنے پروانے پر بلجیم، ہالینڈ اور جرمنی کے نام بھی لکھا لوں اور ممکن ہو تو جرمنی ہو آؤں۔ اس طرح جناب میں نے کل ہی پروانۂ راہداری پر ضروری ناموں کا اضافہ کرایا ہے اور تیرہ یا چودہ تاریخ کو پیرس جانے کے متعلق اور ۱۴ یا ۱۵ کو وہاں سے جرمنی جانے کے متعلق سنجیدگی سے غور کر رہا تھا۔ اگر آپ ایک ڈاکٹری کے طالب علم مسمی عبدالعلی خاں رامپوری سے واقف ہوں اور انہیں ایسی جگہ بھیجدیں کہ میرے حدودِ جرمنی میں داخل ہوتے ہی وہ مجھے مل جائیں۔ یا آپ خود ہی اتنی تکلیف فرمائیں تو میں بہت ہی ممنون ہونگا۔ اس صورت میں فرینکفرٹ ڈاکٹر نارڈین سے بھی مل لونگا اور ایک دو روز کے لئے برلن بھی چلا جاؤنگا۔ جو صاحبان میرے خیالات معلوم کرنا پسند کرینگے۔ اُن کے سامنے جو کچھ رطب و یابس ہے پیش کر دونگا۔ از راہِ کرم تار کے ذریعہ سے مجھے مطلع فرمایئے کہ آپ کیا انتظام کر سکیں گے۔ خدا نہ کرے کہ ڈاکٹر فان نارڈین اپنے ایک ہی معائنہ کی فیس میں میرا دیوالہ نکال دیں۔ میں آجکل بہت ہی نادار ہو رہا ہوں اور تین ماہ کے مصارف کے لئے جو رقم میرے پاس تھی اُسے دو مہینے سے بھی کم میں خرچ کر چکا ہوں۔ یہ ذکر میں نے اس لئے کر دیا ہے کہ میں آپ سے یہ درخواست کرنے والا ہوں کہ میرے لئے کسی ایسے ہوٹل میں بندوبست کیجئے گا جو ایک غریب آدمی کے لئے موزوں ہو اور پھر غریب بھی ہندوستان کا۔ عبدالعلی خاں رامپوری کو میرے سفرِ جرمنی کے ارادہ کی اطلاع دینی نہ بھول جائیگا۔

آپ میرے ٹیلیفون نمبر پر جو اسٹریتھم ۶۰۵۷ ہے تار بھیج سکتے ہیں اور جواب میں میں آپ کو اپنی لندن سے روانگی اور پھر پیرس سے روانگی کے تار بھیج دوں گا۔ یہ میں آپ ہی کی مرضی پر چھوڑتا ہوں کہ میں آپ سے بلجیم میں ملوں یا براہِ راست جرمنی کو چلا

جاؤں۔ لیکن مہربانی کرکے ڈاکٹر فان نارڈین کے متعلق سب باتیں ضرور معلوم کرکے رکھیے۔ تاکہ جب ہی ہم فرینکفرٹ پہنچیں۔ تو اُن سے ملاقات کا انتظام کیا جاسکے۔

(ترجمہ از انگریزی) "ہمدرد"

آپ کا مخلص

محمد علی

(تقریباً وسط اگست ۱۹۱۳ء)

(۱۶)

دارُالشّفافرینکفرٹ

(۱)

پروفیسر ڈاکٹر فان نارڈین کا ذاتی مطب و شفاخانہ، سڑک کا نام شفر، مکان کا نمبر ۸، ۷، مقام فرینکفرٹ بر دریائے مین، ملک جرمنی۔

۲۱۔ اگست ۱۹۲۸ء

پیارے ماجد میاں ظفرالملک صاحب، وجعفری۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔
پروفیسر ڈاکٹر فان نارڈین صاحب (جن کو یہاں گیہایم راٹ یعنی "علامۂ فن طب" کہا جاتا ہے) کے مطب بلکہ یُوں کہیئے کہ ذاتی شفاخانہ میں بستر پر پڑا ہُوا، بلکہ یوں کہیئے کہ بستر سے بندھا ہُوا۔ تاکہ سیدھے پاؤں کو اگر خفیف سے خفیف حرکت دینا چاہوں بھی تو نہ دے سکوں، یہ خط آپ حضرات کو تحریر کر رہا ہوں، جو خط پیرس سے چل کر اور ریل میں بیٹھ کر ۱۶ کو لکھوایا گیا تھا اور فرانس کی سرحد کے قریب ہی سے ڈالا گیا تھا۔ اس میں پاؤں میں ۱۴۔ اگست کو یکایک سخت درد پیدا ہو جانے اور اس کے باعث حرارت بھی ہو جانے کا ذکر کر چکا ہوں۔ میرے عزیز دوست اور ڈاکٹر انصاری کے ساتھ کے پڑھے ہُوئے، ڈاکٹر بہجت وہبی، مصری وطن والے اور ترکی رعایا ایم ڈی ہیں اور قاہرہ کے طبی کالج میں تشریح کے نہایت قابل پروفیسر رہ چکے ہیں۔ گو اب مطب نہیں کرتے اور نہایت سائنٹیفک طریقہ پر ترکی مٹھائی "راحت لقوم" جس کا انگریزی نام "ترکش ڈلائٹ TURKISH DELIGHT" ہے۔ اپنی ہی قائم کردہ فیکٹری میں جو پیرس کے مضافات میں سین کلو جیسی دلآویز جگہ میں بنایا کرتے ہیں۔ میں نے جب سوئٹزرلینڈ ہی میں اُنہیں مانٹیرو کے پاس اسے تیار کرنے میں ۱۹۲۰ء میں دیکھا تھا، جہاں معزول ترکی خلیفہ عبدالمجید آفندی قسطنطنیہ سے جلاوطن کئے جانے کے بعد سب سے پہلے

۱۹۲۴ء میں پناہ گزین ہوئے تھے تو میں اُن کی مرضی مولا ہونے کا قائل ہو گیا تھا۔
مطب کرنے، علم التشریح پڑھانے اور "راحت لقوم" بنانے میں تو کسی قدر مناسبت بھی ہے، میرے ایک کرم فرما جو حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہندوستانی دواخانہ کے بہترین مجربات بھی تیار کرایا کرتے ہیں، گاجر کا حلوہ بھی بے مثل تیار کر لیتے ہیں مگر میں نے ڈاکٹر رہبی کا اسم گرامی سب سے پہلے غالباً ۱۹۰۷ء میں سنا تھا، اور وہ اس طرح کہ مدراس کے روزانہ انگریزی اخبار "محمڈن" نے ان کا مضمون نقل کیا تھا۔ جسے انیسویں صدی اور ما بعد NINE TEENTH CENTUARY & AFTER میں اُنہوں نے "اتحاد اسلامی" پر شائع کرایا تھا اور جس سے بہتر اسلام اور بہترین اسلامزم کے مرادف ہونے کا ثبوت میں نے کسی تحریر میں نہ پہلے دیکھا تھا۔ نہ آج تک دیکھا ہے۔ ان کے متعلق انشاء اللہ میں پھر کبھی تفصیل سے کچھ لکھونگا۔ اس وقت اتنا ہی لکھتا ہوں کہ ان کی راحت لقوم کو میں نے قسطنطنیہ کے ماہر فن رکابدار حاجی بکیر سے جسکے کام کا ساری ترکی میں اور یورپ تک میں شہرہ ہے، بہتر پایا تھا اور ہمارے رفیق سیاست ڈاکٹر نہاد رشاد (ترک) نے، جو پیرس میں ہمارے "بیورو" کے روح رواں تھے، جب یہ سُنا تھا تو فرمایا تھا کہ اگر وہ حاجی بکیر کی برابر ہی "راحت لقوم" بنالیں گے، تو لاکھوں کما لیں گے۔ اس وقت ڈاکٹر صاحب سوئٹزرلینڈ میں جلاوطن ترکوں کے ساتھ رہ رہے تھے، اور سائنٹیفک طریقے پر راحت لقوم بنانے کے تجربے فرما رہے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے ایک مصری پاشا عزیز عزت پاشا کی شرکت میں پیرس میں اس کا اور چاکولیٹ وغیرہ کا کارخانہ کھولدیا، جو اب تک قائم ہے جب میں پیرس ۱۶ جون کی شب کو پہنچ رہا تھا تو انہیں کو تار دیا تھا کہ اسٹیشن آکر مجھے مل لیں اور جب دوسرے دن ان سے ملا تھا تو اُنہیں کے ذریعہ سے پیرس کی یونیورسٹی سار بون کے ذیابیطس کے علاج کے ماہر پروفیسر مارسیل لابے سے ملا تھا اور ان کو اپنا حال جا کر سنایا تھا۔ گو علاج سوائے کرنل آسٹن کے کسی کا مقصود نہ تھا۔ انہیں سے پیرس چھوڑتے وقت کہہ آیا تھا کہ جب لندن سے فارغ ہو کر

کچھ دن فرانس آکر رہو نگا تو ایک مختصر سے جھونپڑے کی ضرورت ہوگی، کسی خوشنما منظر کے قریب، سین کلو میں، سین ژرمیں یا فاشائن بلو میں تلاش کر رکھیں۔
اس بار بھی انھی کو اپنے آنے کا تار دیا تھا اُنھوں نے میرا پاؤں دیکھا مگر تشخیص مرض نہ کر سکے۔ درد نہ صرف پیرس کے دو دن کے قیام تک باقی رہا بلکہ پیرس سے فرینکفرٹ آتے ہُوئے اور یہاں آکر بھی باقی رہا۔ چٹو پادھیا صاحب کو پہلے ہی لکھ چکا تھا۔ کہ میرے رامپور کے ہموطن اور علیگڈھ کے کلاس فیلو حنیف خاں صاحب (عُرف عمرا خان صاحب چترالی) کے صاحبزادے کو لکھ دیا کہ یا تو جرمن سرحد ہی پر یا فرینکفرٹ آکر میرے ترجمان بن جائیں۔ ان کا نام عبدالعلی خان ہے اور یہ "علی برادران" کے بھتیجے ہیں۔ اس کے علاوہ چٹو پادھیا صاحب ہی کے ذریعہ سے ڈاکٹر فان نارڈین سے بھی ملاقات کا وقت مقرر کر چکا تھا۔ فرینکفرٹ ہم رات کے پَونے نَو بجے پہنچے اور اسٹیشن پر عبدالعلی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ پاس ہی کے ایک ہوٹل میں قیام کیا اور چار دن کے فاقہ کے بعد (جس میں نارنگی اور انگور کا عرق پیا تھا) پاس کی ایک رسٹوران میں جاکر کھانا کھایا، مگر درد کی تکلیف کے باعث سب سے پہلے ڈاکٹر صاحب کے گھر ملاقات کے مقررہ وقت دریافت کرنے کے لئے ٹیلیفون دلوایا اور معلوم کیا کہ دن کے گیارہ بجے مطب میں ملیں گے۔ چنانچہ دو نارنگیوں کا عرق چوس کر اُدھر کو روانہ ہُوا۔ عجیب شاندار مطب ہے۔ پورا ہوٹل معلوم ہوتا ہے اور یقیناً کوئی پچھتر مریضوں کے قیام و طعام و علاج کی تو جگہ ہوگی، ان سے ملا۔ بھاری بھرکم آدمی ہیں۔ سر کے بال سفید ہیں۔ چہرہ سُرخ ہے۔ اور عمر تخمیناً ۵۵ یا ساٹھ سال کی ہوگی۔ ممکن ہے کہ زیادہ ہو۔ انگریزی سمجھ لیتے ہیں اور بول بھی خاصی لیتے ہیں۔ یہاں کون ہے جو انگریزی یا فرانسیسی بالکل نہیں جانتا۔ اُن کی ماہرہ جراثیم، جو خون اور قارورہ وغیرہ کا کیمیاوی امتحان کیا کرتی ہیں، نہایت عمدہ انگریزی بولتی ہیں اور بلا تکلف اُن کے رفیق کار اور ان کے دونوں اسسٹنٹ جن

سے ملنے کا اتفاق ہوا، وہ بھی خاصی بول لیتے ہیں۔ اُن کی ہیڈ نرس بھی اچھی طرح بولتی ہیں اور جو نرس میری تیمار داری کرتی ہیں وہ بھی مطلب سمجھ لیتی ہیں اور سمجھا دیتی ہیں۔ کسی نہ کسی قدر انگریزی ہر ایک نرس جانتی ہے۔ دربان اچھی طرح انگریزی جانتا تھا، ایک کمرہ میں ہمیں بٹھایا گیا اور کہا کہ پروفیسر آپ کو ابھی بلاتے ہیں، ایک اور مریض کے متعلق مشورہ ہو رہا ہے۔

دس منٹ بعد میری باری آئی۔ پروفیسر نے کوئی پون گھنٹہ تک میرا تمام حال سُنا، پھر فاروری امتحان کرانے کے لئے لیا اور کپڑے اتروا کر دل اور پھیپھڑوں کا امتحان کیا۔ مجھے کہنے لگے اس طرح چند گھنٹے رہنا کافی نہیں ہے۔ تمہارا کیس بہت دلچسپ ہے۔ میں خود اپنے لئے اور سائنس کے لئے اس کی تحقیقات ضروری سمجھتا ہوں۔ تم برلن جا کر پھر یہاں چلے آؤ۔ اور ہوٹل میں قیام نہ کرو۔ میرے مطب ہی میں رہو، تاکہ میں بار بار تمہیں دیکھ سکوں اور ہر وقت کے حالات کا معائنہ کر سکوں، اور تمہاری غذا اور بود و باش کے طریقہ کو ایک نظم میں لا کر رائے قائم کر سکوں۔ میں نے وعدہ کیا کہ چھٹو یا دھیا سے مل کر ۱۹ کی شب کو چل دونگا اور کم از کم تین چار دن رہ کر لندن واپس جاؤنگا۔ اور ضرورت ہو گی تو لندن سے رخصت ہونے پر بجائے فرانس اور سوئیٹزرلینڈ جانے کے فرینکفرٹ ہی چلا آؤنگا۔ بالآخر میں نے موزہ اُتار کر اپنا سُوجا ہوا دہنا پاؤں دکھایا اور وہ بیچ کی انگلی جس پر آبلہ سا پڑا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی ان کے چہرہ پر تردّد اور پریشانی کے آثار صاف نظر آنے لگے اور اُنہوں نے کہا کہ میں تمہیں برلن جانے کی اجازت نہیں دے سکتا، بلکہ ہوٹل تک بھی تمہیں نہ جانے دونگا، تم کو اسی وقت بستر پر دراز کرا دیا جائیگا۔ خداوند کریم کا شکر ہے کہ تم ٹھیک وقت پر آ گئے ہو، ورنہ چند گھنٹہ بعد ہی شائد حالت نہایت خطرناک ہو جاتی۔ میں CONSERVATIVE TREATMENT کرونگا اور اس انگلی کو بھی بچانے کی کوشش کرونگا۔ اگر دیر ہو گئی ہوتی تو غالباً پاؤں کاٹنا پڑتا۔ یہ ابھی ابتدائی گنگرین ہے

اور خدا کرے کہ بڑھکر پوری گنگرین نہ ہو جائے۔ عبد العلی خاں کو اس مرض کا انگریزی نام نہیں آتا تھا مگر جرمن نام لیتے تھے! وہ کہتے تھے کہ ہم نے اس میں کتنے ہی پاؤں اور ٹانگیں کاٹ کر پھینک دی ہیں۔ چنانچہ اسی وقت ہم نے عبا اور کرتہ اور جوتے اُتار دیئے اور پلنگ پر دراز ہو گئے۔ ایک ڈھانچہ جس پر روئی اور کپڑا لپٹا ہوا تھا، لایا گیا۔ دو تین موٹے موٹے گدے یا تکیے لائے گئے۔ اس پر وہ ڈھانچہ یا فریم رکھا گیا، اس پر پوری دائیں ٹانگ رکھی گئی اور کپڑا رکھ کر پٹی باندھ دی گئی اور پیر کو ڈھانچے کے ساتھ اس طرح باندھ دیا گیا کہ اگر میں اسے ہلانا بھی چاہوں تو نہ ہلا سکوں۔ جس احتیاط سے ساری ٹانگ کے نیچے اور ڈھانچے کے اُوپر، یعنی دونوں کے درمیان روئی کے متعدد پہل رکھے جاتے ہیں۔ اس سے مجھے اپنے مرض کے خطرناک ہونے کا مجبوری احساس ہوتا ہے۔ درد پاؤں کی اُنگلی میں نہ تھا، پُشت پا کے دائیں طرف یعنی باہر تھا! اور ٹھیک یہیں میرے خسر عظمت علی خاں صاحب مرحوم کے ایک پھنسی نکلی تھی، جس کے باعث ان کو اس قدر تکلیف ہوئی تھی کہ منڈلیشر سے جہاں وہ "صوبہ دار" تھے سنادو کے اسٹیشن تک، ٹانگے میں آنے کے قابل بھی نہ رہے تھے۔ بلکہ پالکی میں لائے گئے تھے۔ اندور لا کر پھنسی چیری گئی تھی مگر ذیابیطیسی خون میں اندمال کی طاقت باقی نہ تھی۔ انگور نہیں بندھنے پاتا تھا۔ روز بد گوشت کاٹا جاتا تھا اور (۔۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔) کے پھائے ڈالے جاتے تھے۔ اور اس کے قطرے دن رات ٹپکائے جاتے تھے۔ چند دن بعد گردن میں بھی کاربنکل نکلا۔ جس کو بعد میں وائسرائے لارڈ ہارڈنگ کے سرجن جیمس یا برٹش ریذیڈنسی سرجن اندور ہی نے شگاف دیا تھا۔ مگر اسی دن جان نکلنا شروع ہو گئی اور تہجد کے وقت وہ اس عالم فانی سے رخصت ہو گئے۔ عجیب اتفاق ہے کہ جن چچا سے انہیں عشق تھا، یعنی میرے والد مرحوم۔ اسی دن ان کا بھی انتقال ہوا تھا۔ ایک کا ۱۷۔ رمضان المبارک (یوم بدر و یوم الفرقان) کو مغرب کے وقت۔ دوسرے کا اس کے بعد کی شب میں، گو فاصلہ ۲۷ برس کا تھا۔

اب اس توارد کو دیکھئے کہ نہ صرف میرے اس جگہ درد تھا جہاں عظمت علی بھیا مرحوم کے پھنسی نکلی تھی۔ بلکہ میری عمر بھی اب ٹھیک وہی تھی جس عمر میں اُنہوں نے انتقال فرمایا تھا مگر میرا قیاس تھا کہ غالباً ابھی میں نہ مروں بلکہ کچھ کر کے مروں۔ کیونکہ میں اسی دن جس دن لندن سے روانہ ہوا تھا، بال بال مرتے مرتے بچا تھا۔ وہ اس طرح کہ نواب صاحب بہادر پالن پور سے (جن کے والد بزرگوار کی دعوت پر میں سدھ پور سے جہاں بڑودہ میں چار برس تک رہا تھا۔ اور جو پالن پور سے صرف ایک ہی اسٹیشن کے فاصلہ پر ہے، میں پالن پور گیا تھا۔ اور ان کے دونوں نوجوان صاحبزادوں سے بھی نیاز حاصل کیا تھا اور جو مجھ پر اُس وقت سے برابر نوازش کرتے چلے آئے ہیں) میں ہوٹل سیسل میں ملنے گیا تھا۔ سخت شرمندہ تھا کہ گو ہم دونوں ایک ہی جہاز میں پورٹ سعید سے آئے تھے اور کمرے بھی پاس پاس ہی تھے اور ان کے ایک مہمان اور دوست، ٹھاکر صاحب بہادر لیمبڈی کے صاحبزادے، اور ان کے پرائیویٹ سیکرٹری تو میرے ہی کمرہ میں تھے، لیکن لنڈن آنے کے بعد نیاز حاصل نہ کر سکا تھا۔ جس دن اپنا فاقہ ختم کر کے ملنے گیا تھا تو معلوم ہوا تھا کہ کل ہی برِاعظم یورپ تشریف لے جا چکے ہیں اور ۱۲ اگست کو واپس تشریف لائیں گے۔ کئی ہفتہ کا انتظار کرنے کے بعد ۱۲۔ کو ٹیلیفون پر پوچھا تو معلوم ہوا کہ ۱۳۔ کو تشریف لائیں گے، چنانچہ ۱۲۔ جس دن کہ میں خود عازم برِاعظم یورپ تھا، طامس کک کے ہاں سے کچھ روپیہ لیکر، اور گاڑیوں کا وقت اور کرایہ دریافت کر کے اسٹرینڈ نامی سڑک کی طرف ہوا۔ اس گزرگاہ پر جس قدر آمد و رفت ہوتی ہے بمشکل ہی سے کسی اور گزرگاہ پر ہوتی ہو۔ ویسٹ اینڈ West End سے جہاں اُمرا رہتے اور خرید و فروخت کرتے ہیں۔ ایسٹ اینڈ سٹی EAST END کو، جہاں سب سے زیادہ کاروبار ہوتا ہے، یہی راستہ ملاتا ہے۔ ایک زمانہ میں تو یہ بے حد تنگ تھا لیکن بعد کو اس میں نہ صرف کثیر توسیع کر دی گئی ہے۔ اور جس طرح کانپور کی مچھلی بازار روڈ میں ہنود کے ایک مندر کو میرے حبیب صادق لارڈ میسٹن نے ایک جزیرہ بنا کر بچا دیا تھا مگر

بساحلی بازار کی مسجد کے ایک حصہ کو نہیں بچایا تھا۔ اسی طرح یہاں بھی متعدد جگہ بطور جزائر بناکر بچا دیئے گئے ہیں، ابھی اور توسیع باقی ہے اور ایک دوکان سے دو تین چھوٹی چھوٹی ٹائم پیس نصف داموں پر مجھے بھی اسی باعث مل گئی ہیں کہ وہ دوکان توسیع کے باعث گرائی جانے والی ہے۔ اب سلئیے کہ اس گزرگاہ عام کے وسط میں لنڈن کا ایک مشہور ترین ہوٹل سیسل نامی بھی ہے۔ جہاں سری نواس آئنگر صاحب قیام فرما چکے تھے! ور جہاں نواب صاحب بہاور پالن پور قیام فرما ہیں۔ عین اس جگہ سڑک کسی قدر خراب ہو چکی تھی۔ اور چونکہ اگست لنڈن والوں کے لئے رخصت پر جانے کا مہینہ ہے۔ اس لئے عام طور پر آجکل سب سڑکیں درست کی جا رہی ہیں، چنانچہ آسٹرینڈ کا ایک حصہ بھی اُدھیڑا اور بنایا جا رہا تھا۔ میں عین ہوٹل سیسل کے سامنے بس پر سے اترا اور چونکہ تیز سے تیز موٹر چلانے والے بھی راستہ کے قاعدہ کا خیال رکھتے ہیں، یعنی جانے والے سڑک کی بائیں جانب سے جاتے ہیں! ور آنے والے بائیں جانب سے (گو اپنی وہ بھی بائیں جانب سے) اس لئے سڑک کے ایک طرف سے دوسری طرف کو جانا ہو۔ تو عبور کرتے وقت لوگ یہ دیکھ لیا کرتے ہیں کہ اُن کے عقب سے تو کوئی نہیں آ رہا ہے۔ اگر کوئی موٹر وغیرہ نہ آ رہی ہو تو آدھی سڑک طے کر کے وسط میں رُک جاتے ہیں۔ پھر اپنے سامنے کی طرف دیکھ لیتے ہیں کہ سامنے سے یعنی اُن کے دائیں طرف سے تو کوئی نہیں آ رہا ہے اور اگر کوئی موٹر وغیرہ نہ آتی ہو۔ تو اس نصف سڑک کو بھی عبور کر لیتے ہیں۔ آج تک برابر اسی طریقہ پر سڑکیں عبور کرتا رہا لیکن ۱۳۔ اگست کو یہ غلطی ہوئی کہ جب بس سے اُترا اور دیکھا کہ آدھی سڑک میرے بائیں ہاتھ والی ٹوٹی ہوئی ہے اور بند پڑی ہے اور دونوں طرف سے آنے جانے والی سواریاں صرف داہنے ہاتھ والی نصف سڑک پر چل رہی ہیں تو اس کا خیال نہ رکھا اور یہ سمجھ کر میں پہلے صرف نصف سڑک کو عبور کرونگا۔ اپنے عقب سے آنے والی گاڑیاں دیکھ لوں۔ اگر کوئی نہ آتی ہو تو گزر جاؤں۔ نہایت احتیاط سے دو تین بسوں کو گزر جانے دیا اور جب عقب کا راستہ

بالکل صاف نظر آیا۔ تو نہایت اطمینان سے سڑک کے اس نصف حصّہ کو عبور کرنا شروع کیا۔ حالانکہ دراصل ساری سڑک اب یہی نصف حصہ تھا اور مجھے ایک چوتھائی حصّہ کو اس طرح عبور کر کے رُک جانا چاہیئے تھا۔ اس لیے کہ باقی چوتھائی حصّہ پر دوسری طرف سے گاڑیاں آ رہی تھیں وہ اور بھی نظر سے اوجھل ہوگئیں۔ لیکن جب چوتھائی سڑک طے کر چکا تو دیکھا کہ تین چار قدم ہی کے فاصلہ پر ایک بڑی موٹر لاری آ رہی ہے۔ فوراً رُکنا چاہا مگر رُکنا آسان نہ تھا۔ لاری والے کے لئے روکنا اور بھی مشکل تھا۔ البتہ وہ لاری کو اپنے بائیں طرف موڑ سکتا تھا، چنانچہ کچھ میں رُکا، کچھ اُس نے موڑا، صرف خیریت اسی پر گزری کہ میری بائیں کہنی اس کے آگے کے پہیّہ کے گارڈ پر لگی اور میں نے اپنے تئیں اس کے پہیّوں میں کچل جانے سے بچا لیا۔ ان دو چار سیکنڈوں میں جو لاری کو دیکھنے اور اس سے بچنے کی کوشش میں لگے۔ ان میں تو میں نے سمجھ لیا کہ بس اب گیا۔ مگر جونہی چار پانچ سیکنڈ بعد بالکل بچ گیا، اور جسم کے کسی حصہ میں خراش تک نہیں آئی تو یقین ہوگیا کہ خداوند کریم کو ابھی مجھے دنیائے فانی سے اٹھانا منظور نہیں ہے۔ چنانچہ باوجود اس عجیب توارد کے جو عظم صاحب کے والد مرحوم اور میری حالت عمر میں واقعہ ہُوا مجھے پوری امید تھی اور ہے کہ جلد صحتیاب ہو جاؤں گا۔ اور اس وقت تک سب علامتیں اس کی پائی جاتی ہیں۔

پاؤں کو مطلق حرکت نہ دینے اور ادبجار کھے رہنے کا یہ نتیجہ ہُوا کہ دوسرے دن سوجن کم تھی اور جب آبلہ میں شگاف دیا گیا اور مادہ نکلا تو معلوم ہُوا کہ اس میں کوئی خاص چیز ایسی نہ تھی جس سے کچھ زیادہ خطرہ ہو۔ قارورہ کا ہر روز تین بار امتحان ہوتا ہے، شکر بالکل نہیں آ رہی ہے فالحمد للہ۔ پرفیسر صاحب کو خون کے امتحان کی بہت فکر تھی۔ پہلے دن چونکہ دو نارنگیوں کا عرق پی کر آیا تھا، اس لئے احتیاطاً اس دن امتحان نہیں کیا گیا۔ ہفتہ کو یعنی ۱۸ اگست کو میرا بایاں کان چھیدا گیا۔ تاکہ کان کی لَو میں کچھ خون لیا جا سکے۔ الحمد للہ کہ خون میں بھی شکر کی مقدار صرف ۱۲۵ ہو نکلی جو نارمل NORMAL

کے برابر ہی ہے۔ نارمل مقدار ۸۰ سے لیکر ۱۲۰ تک سمجھی جاتی ہے۔ یقیناً کرنل آسٹن کے علاج نے فائدہ کیا تھا اور قارورہ اور خون دونوں کے امتحان نے اِس کا کافی ثبوت دے دیا۔ ورنہ جب میں لندن پہنچا تو اس وقت قارورہ میں شکر کی مقدار ۳ء۴۳ فی صدی تھی۔ اور جب کلکتہ کے مشہور سوراجی ڈاکٹر رائے نے جنوری میں امتحان کیا تھا۔ تو شکر کی مقدار قارورہ میں ۵ فیصدی اور خون میں ۳۰ء۴ فیصدی تھی۔ جو نارمل سے چوگنی، پنج گنی کے قریب تھی۔ درد صرف پشت پا میں تھا۔ بلکہ پنڈلی کی ہڈی کے دونوں جانب تھا، اور معلوم ہوا کہ رگیں پھول گئی تھیں! اور خون کی روانی میں کمی تھی۔ مگر اب وہاں نہایت ہی خفیف سا درد ہے۔ جانگ کے پاس گلٹی نکل آئی تھی جس میں تکلیف تھی، اب وہ باقی نہیں ہے۔ چونکہ کراچی کے جیلخانے ہی میں ۱۹۲۰ء میں تلووں میں سوزش شروع ہوئی تھی۔ اور اسی کے باعث ۱۹۲۶ء میں مکہ معظمہ میں موتمر عالم اسلام کے دوسرے اجلاس سے ذرا ہی پہلے قلب کی طرف کا آدھا جسم مفلوج جیسا ہوا جاتا تھا اور سوا گھنٹہ تک یہی کیفیت رہی تھی، اور ۱۹۲۸ء کی ابتدا سے پیروں کے تلووں کی اعصابی سوزش نے زندگی کو موت سے زیادہ تکلیف دِہ بنا دیا تھا، جو اب تک ایک خاص حد تک باقی ہے! ورنہ یوں تو دونوں پیروں کے تلوے اور انگلیاں ایک حد تک اپنا حِس کھو چکی ہیں۔ اسلئے کل وائیں ہاتھ میں جہاں بانہہ ختم ہوتی ہے، رگ میں سے کوئی چھٹانک بھر خون نکالا جا چکا ہے تاکہ یورک ایسڈ (پیشاب) کا بھی امتحان کر لیا جائے اور آج انشاءاللہ ٹانگوں کی ہڈیوں اور رگوں کا عکس ریز X. RAYS کے ذریعہ سے فوٹو لیا جائیگا اور اسی کے بعد پروفیسر صاحب کوئی رائے قائم کر سکیں گے۔ ان کے تشریف لانے اور اسی مصوری کا انتظار ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ خون کا دباؤ بھی کم ہے۔ جب کلکتہ میں جنوری میں لیا گیا تھا تو ۱۶۵ تھا۔ حالانکہ میرے لئے نارمل ۱۴۹ ہونا چاہیئے۔ مگر اب صرف ۱۴۰ ہے۔ ٹمپریچر دن میں چار بار لیا جاتا ہے، اور اسی

طرح نبض کی حرکت بھی شمار کی جاتی ہے۔ تھرمامیٹر یہاں صرف سنٹی گریڈ ہوتا ہے جس میں نارمل ۳۷۶۴ ہے۔ پہلے تو اس قدر تھا مگر اب برابر ۳۶۶۴ سے لیکر ۳۶۶۹ تک جاتا ہے۔ اس سے نہیں بڑھتے پاتا۔ نبض ۸۰ اور ۸۸ کے درمیان میں رہی ہے۔ غذا وہ رکھی گئی ہے جو کرنل آسٹن نے بتائی تھی یعنی پھل اور سلاد یعنی کا ہو ٹماٹر اور کھیرا ککڑی مگر یہاں پانچ وقت غذا دیجاتی ہے۔ ایک علی الصباح چائے اور پھل، اس کے بعد دس بجے جرمن فطیر ثانی یعنی سیکنڈ جرمن بریکفسٹ SECOND BREAKFAST - اس میں میرے لئے صرف چند پھل ہوتے ہیں۔ مثلاً آڑو یا ناشپاتی۔ پھر ایک بجے لنچ ہوتا ہے جس میں پہلے سلاد اور پھل دیئے جاتے تھے ۴ بجے چائے اور پھل، اور ساڑھے سات بجے یا آٹھ بجے پھر ڈنر یا یہاں کی اصطلاح میں ابینبر اس لئے کہ یہاں کا ڈنر دوپہر کا لنچ قرار دیا جاتا ہے۔ اس میں بھی سلاد اور پھل ہوا کرتے تھے۔ پھلوں میں خربوزہ کو خاص طور پر پروفیسر صاحب نے شروع ہی سے اصرار کرکے دینا شروع کیا۔ حالانکہ ڈاکٹر انصاری وغیرہ اس کو کاربوہائیڈریٹس کی بنا پر یعنی گیہوں کے نشاستہ کی طرح کی چیز اس میں ہونے کی بنا پر ممنوع قرار دیا کرتے تھے۔ کرنل آسٹن تو کسی پھل کے بھی خلاف نہ تھے اور انگور اور خرما کھلاتے تھے۔ فان نارڈین بھی کہتے ہیں کہ ہم انجیر اور خرما تو نہیں دیا کرتے البتہ کرنل آسٹن نے کیلا ممنوع قرار دیا تھا، مگر یہاں کل ایک کیلا بھی دیا گیا پہلی شب کو ایک نیم برشت انڈا ملا تھا۔ مگر پھر نہیں۔ چائے میں دودھ آج سے پہلے ملتا رہا مگر آج صبح لیموں ملا۔ شکر کی جگہ سیکرین ملتی ہے مگر رقیق، جو بالکل بدمزہ نہیں ہوتی۔ البتہ پہلے دن کے بعد سے نمک بالکل بند ہے۔ اور یقین جانئے کہ اس سے شکر کا بند کیا جانا بھی کم اذیت ہے۔ تعجب ہے یہ بھی کرنل آسٹن ہی چاہتے تھے۔ اور اسی لئے میں نے گوشت اور ترکاری کھانا بھی چھوڑ دیا تھا صرف پھل کھایا یا ککڑی۔ پیرس میں بھی غالباً ماریسل لابے کے کہنے سے ڈاکٹر ہجبت وہبی نے نمک بند کرنے کے لئے کہا تھا۔

دریافت کرنے سے معلوم ہوا۔کہ قارورہ میں کچھ خفیف سا اثر" اس ٹون" ACCETONE
زہر کا نکلا تھا۔یہ دہلی میں بھی تقریباً برابر جاری رہا تھا۔مگر PANKREPTINE
کی جگہ یعنی انسولین کی گولیاں کھانے سے کم ہوگیا تھا۔ نام ہی کو باقی تھا۔انگلستان
میں ابتداءً بالکل نظر نہیں آیا۔کل پروفیسر نے خود دیکھکر غذا میں اضافہ کردیا،اور اب
ذیابیطس کی روٹی،جو روٹی کیا ہوتی ہے۔ پاپڑ پاپڑ سے زیادہ ہلکی،ملنے لگی ہے اور تازہ
پنیر ،مگر افسوس کہ بے نمک!! اس کے علاوہ تین بار چھاچھ ملتا ہے،یعنی دُودھ جس میں سے
مکھن نکال لیا گیا ہو۔ یہاں کا دُودھ تو بہت ہلکا نظر آیا (شاید عمداً پانی ملا کر دیا جاتا ہو)
کرنل آسٹن نے تو میرے لئے بند ہی کر دیا تھا۔گو کسی قدر بالائی کی اجازت تھی۔مگر
چھاچھ خوب گاڑھا اور مزے دار ہوتا ہے ۔کل ذرا بیچ بدن کی صفائی کے ساتھ جو ایک
غسل آکر کیا کرتا ہے۔الکحل اور دیگر ادویہ کا ایک مرکب بھی بدن پر مل دیا جاتا ہے تاکہ
علاوہ صفائی کے پیٹھ پلنگ پر پڑے پڑے نہ لگنے پائے۔مگر آج تو بحید تھک گیا ہوں۔
دائیں ٹانگ پلنگ سے ایک فٹ سے بھی زیادہ اونچی رکھی جاتی ہے اور اگر کسی قدر تکیہ لگا کر
بیٹھتا ہوں تب تو زاویہ اور بھی تنگ ہو جاتا ہے!اور جلد تھک کر لیٹ جانا پڑتا ہے ۔
یہ خط زیادہ تر لیٹے لیٹے لکھا گیا ہے!اور اب چونکہ سب کچھ پوری پوری تفصیل کے
ساتھ لکھ چکا ہوں اس لئے اب اسے ختم کرتا ہوں۔ اتنا اور لکھدوں کہ نیند خوب آتی
ہے ۔مجبوراً دس بجے عشا سے فارغ ہو کر سونا شروع کرتا ہوں،اور گو فجر کے قریب ہی
آنکھ کُھل جاتی ہے،مگر کوئی وضو کرانے والا نہیں ہوتا۔اسلئے پھر سو جاتا ہوں اور کوئی
ساڑھے سات بجے اٹھتا ہوں۔الحمد للہ کہ طہارت اور وضو کا اچھا انتظام ہو گیا ہے۔
روئی کی نئیں تھیلوں پر لوٹے کی ٹونٹی سے پانی دلوا کر استنجا کر لیا کرتا ہوں۔ ہمارے
وضو اور طہارت کا نرسوں پر بہت اچھا اثر پڑا ہے ۔نیز ستر عورت کی احتیاط کا۔
چلتے وقت اپنی نرس Schwester Hilldegard Arnold خوبصورت نہیں کہ

تعریف بھی کردوں۔ نہایت نیک صورت بی بی ہے اور جس محنت سے میری تیمارداری
کرتی ہے۔ اس سے زیادہ محنت سے تو میری والدہ ماجدہ اور میری بیگم صاحبہ بھی نہ کر سکتیں۔
یہ ساری منزل اسی کے سپرد ہے، اور اگر وہ تمام سولہ کمروں کے مریضوں کی اس محنت
سے تیمارداری کرتی ہے تو یقیناً دن رات میں ۲۴ گھنٹہ سے بھی زیادہ کام اسے کرنا پڑتا ہے
مگر میرا خیال ہے کہ جو دو ڈھائی گھنٹہ وہ مجھ پر صرف کرتی ہے، وہ خاص مہربانی ہے، اُس
کی ایک اسسٹنٹ بھی ہے، جو اس سے زیادہ نیک صورت اور نیک سیرت معلوم ہوتی
ہے اور دوسرے دن سے وہ بھی میرے یہاں کام کیا کرتی ہیں۔ مگر پھر بھی ہیڈ گارڈ کی
آمد و رفت اور محنت جاری ہے، بالخصوص میری ٹانگ کو ڈھانچہ میں رکھنے، اس میں
روئی دبانے اور پاؤں کو اس میں باندھنے اور پھر اس پر ایک بٹا کھا نچہ چڑھانے،
اس کو پلنگ سے باندھنے (تاکہ وہ نیچا نہ ہو جائے اور سرک نہ جائے) اور اس پر کمبل
اور چادریں چڑھانے اور بستر تکیے درست کرنے کا کام تو وہ خود اپنے ہی ہاتھ سے دو تین
وقت کیا کرتی ہیں۔ چونکہ یہ اپنے اسسٹنٹ سے زیادہ انگریزی جانتی ہیں اس لئے
ان سے گفتگو بھی زیادہ رہتی ہے اور گو انگریزی بہت زیادہ انہیں بھی نہیں آتی۔ تاہم
کوشش کر کرا کے انہیں انگریزی کے ذریعہ سے دن میں تین چار بار ہنسا دیا کرتا ہوں۔
اور اب اسی پر اس خط کو ختم کرتا ہوں تاکہ نہ آپ کو گمان ہو نہ بیگم صاحبہ اور بچیوں کو،
جن کے لفافے میں اس خط کو بند کر کے بھیج رہا ہوں، تاکہ وہ ایک مختصر سا خط ملنے سے نہ
گھبرا جائیں کہ میں بستر مرض ہی پر نہیں، بستر مرگ پر پڑا ہوا ہوں۔ اور یوں تو جو مرضی
مولا کی۔ جس دن میرا پاؤں دیکھ کر یکایک پروفیسر صاحب سخت متردد ہو گئے تھے تو بار
بار اپنا یہ شعر یاد آتا تھا ؎

تو جو آمادہ ہوا سے دل تو ہے پھر دار بھی ہیچ
آزما دیکھ یہ سب کھیل ہے تیاری کا

یقیناً میں دنیا سے اس قدر بیزار نہیں ہوں کہ مرنے کی دعا مانگوں بلکہ اسے چھوڑتے
وقت آجکل تو ضرور افسوس ہوگا۔ لیکن جہاں تک سوچا اور غور کیا داعی اجل کو لبیک
کہتے وقت انشاء اللہ ہچکچاؤں گا بھی نہیں۔ مگر صحیح معنوں میں نہیں ہوتے " ربنا"
" ربنا ظلمنا انفسنا، وان لم تغفر لنا وترحمنا لنکونن من الخاسرین" آیہ کریمہ بار بار
زبان پر آتی ہے اور سورۂ بقرہ کا حسن خاتمہ۔ خداوند کریم انہیں پر خاتمہ بالخیر کرے۔ ارادہ
تھا کہ سیلان سے گزر کر بیلفنسی نہیں بلکہ توٗل کے بعد سے جو وردون کی طرح ان
فرانسیسی قلعہ جات کی زنجیر کی ایک کڑی ہے جو سوئیٹزرلینڈ کے شمال سے بلفورٹ سے
شروع ہوتی ہے اور وردون تک چلی جاتی ہے اور جس کی باقی ایک کڑی ایپی نال ہے
جو راستہ کا علاقہ متیز تک گیا ہے۔ ۱۸۷۱ء میں کھو کر اب صلح ورسٹیلی کی رو سے
فرانس نے تقریباً نصف صدی بعد پھر حاصل کر لیا ہے۔ اس کا کچھ حال، پھر اس علاقہ
کا جو متیز کے بعد سے سار تک پڑتا ہے۔ جو جرمنوں ہی کا مانا گیا ہے مگر جس پر قبضہ
ابھی فرانسیسیوں ہی کا ہے۔ پھر سار بروکین کے بعد سے فرینکفرٹ تک کا کچھ حال
جس قدر کہ ایک ریل میں بیٹھکر سفر کرنے والے کو معلوم ہو سکتا ہے، لکھکر بھیجوں مگر اس
وقت تک پچیس صفحے ہو چکے ہیں اور بھولتے نہیں کہ میں مریض ہوں اور پلنگ پر پڑا ہوا
حقیقت یہ ہے کہ میں نے اس خط میں بھی طوالت اس لئے پسند کی ہے کہ آپ سب
حضرات کو اور بیگم صاحبہ اور بچیوں کو پورا ثبوت مل جائے کہ میں ابھی بظاہر مر نہیں رہا ہوں
یہ سب کچھ تو ہوا، مگر سوال پیسہ کا ہے۔ یہاں صرف کمرہ کھانے وغیرہ اور نرسنگ کے
روزانہ ۲۵ مارک یعنی ۱۷ روپیہ دینا پڑینگے۔ اور دوا دارو اور پروفیسر صاحب کی فیس
علاوہ ہندوستان کے افلاس کے متعلق میں نے انگریزوں کی اس بار بار کی بکواس
But living is cheaper in India کے بارہ میں
(وہاں کی زندگی تو سستی ہے) اجل کر عرض کیا تھا کہ

Yes, and dying is only just a little cheaper.

(بالکل صحیح فرمایا، اور مرجانا زندگی سے کچھ ہی زیادہ سستا ہے)۔ یہاں کے مصارف کے خوف سے کہنا پڑتا ہے Living is dear in Europe and on the whole, dying is much cheaper

زندگی یورپ میں سخت گراں ہے اور سب چیزوں کا لحاظ کیا جائے تو مرجانا ہی بہت سستا ہے۔ جس چیز کا موت سے بھی زیادہ خوف ہے اپنے اس محسن کو جس نے اس اصرار کے ساتھ مجھے یورپ بھیجا ہے لکھنا ہے کہ ابھی کسی قدر اور روپیہ کی ضرورت ہوگی۔ اسلئے دست بدعا ہوں کہ خدا جلد شفائے کامل عطا فرمائے اب بالکل رخصت ہوتا ہوں۔ عبدالعلی صاحب شب سے میرے ہی کمرہ میں فروکش ہیں اور انہیں ان کا مدرسہ کھلنے تک یا اگر ۱۳ راگست سے پہلے یہاں سے نکل بھاگ سکا تو اس وقت تک اپنے ہی ساتھ رکھونگا۔ ان کی وجہ سے بہت اطمینان ہے بہن ہلڈی گارڈ بیگم صاحبہ اور بچیوں کو سلام شوق پہنچتی ہیں۔ والسلام۔

آپ کا دور افتادہ مریض بھائی

محمد علی

فرینکفرٹ بر دریائے مین ۔ جرمنی ۔ ۲۹ راگست

برادرم ظفر الملک صاحب ۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہٗ

گذشتہ تحریر میں میں اپنی اندیشہ ناک علالت کا حال بالتفصیل دے چکا ہوں ۔ اب اگرچہ اس پیر کے باعث جس میں پیرس میں ۲۴ راگست سے درد ہونا شروع ہو گیا تھا ، اور جس کی انگلی کے آبلہ کو یہاں شگاف دیا گیا تھا کوئی اندیشہ باقی نہیں ہے ، اور انگور بنتا نظر آرہا ہے اور نئی کھال بھی انشاءاللہ دو چار دن میں نکل آئے گی ، مگر پرسوں سے دُوسرے پیر میں پنجہ کے قریب ایک ایک دو دو اور تین تین منٹ سے لے کر پانچ پانچ منٹ میں نہایت تیز درد کی چمک ہو رہی تھی اور رات کو تو اس قدر تکلیف تھی کہ نیند نہ آنے کا اندیشہ تھا ، اس لئے کوئی دس بجے چھوٹے ڈاکٹر صاحب کو بلا کر خواب آور دوا کی دو گولیاں احتیاطاً لے لیں تھیں مگر الحمدللہ نیند ان کے بغیر ہی آگئی اور درد بھی صبح کو باقی نہ تھا ابھی کسی قدر درد شروع ہوا تھا ، مگر مٹکی دوا جو مکمل تین بار مل جا چکی ہے اب بھی ملوا کر پاؤں کو بندھوا دیا ہے ، اور درد بند ہو گیا ۔ میرا ارادہ آج سوائے بیگم صاحبہ کے کسی کو کچھ نہ لکھنے کا تھا چنانچہ ان کے خط میں لکھدیا تھا کہ وہی جعفری کو بھیجدیا جائے لیکن ابھی لندن سے ہندوستان کی ڈاک آئی ہے اور اس میں آپکا مفصل و مشرح نوازشنامہ ملا " ہمدرد " کے متعلق میں اس لئے مایوس ہو رہا ہوں کہ باوجود وقت پر نکلنے کے ، حجم کے بڑھ جانے کے ، اور اس تنوع کے جو فلسطین ، عراق ، اور مصر و قسطنطنیہ وغیرہ کے خطوط کے شائع

ہونے سے پیدا ہو گیا ہے، اور نیز بعض مضامین خاص کی اشاعت سے، اب تک "ہمدرد" کی اشاعت مطلق نہیں بڑھی اسکا جاری رکھنا محض آپ کی محنت شاقہ، اور آپ کی بے نظیر کفایت شعاری کی بدولت ممکن ہؤا ہے۔ پبلک کا مذاق یقیناً بگڑا ہؤا ہے۔ اور مجھے اس طرح اسکے اصلاح کی مطلق امید نہیں ہیں اب تو اور بھی سختی کے ساتھ اپنی پہلی رائے پر قائم ہوں واپسی پر دیکھئے کیا ہو۔ میں یقیناً اب اس قدر محنت شاقہ برداشت نہ کرسکوں گا، اور گو کرنل آسٹن نے فاقہ اور بنا سپتی پر گذر کرنے کا طریقہ خوب سکھا دیا ہے، جس کے باعث میرے ذاتی مصارف اس قدر زیادہ نہیں ہونگے تاہم مجھے خوف ہے کہ میں جعفری کی تنخواہ پر کام نہ کرسکوں گا، لیکن یہ سب آئندہ کی باتیں ہیں۔ بھائی ظفر الملک صاحب! میں آپ کی ہمت اور آپ کے استقلال کا قائل ہوں کہ آپ نے اب تک "ہمدرد" کو جاری رکھا۔ یہ کسی دوسرے کے دل گردے کا کام نہ تھا۔ خداوند کریم آپ کو اس کا اجر دیگا۔ مگر ملک و ملت نے تو خاک اجر نہیں دیا۔ تعجب ہے کہ نشیر آنی صاحب نے بھی مضامین نہیں بھیجے۔ مجھ سے تو کم از کم ہر ہفتہ ایک طول طویل اور مفصل خط" کا اس قدر سختی کے ساتھ مطالبہ تھا۔ افسوس ہے کہ جس ہفتہ لندن سے چلا تھا اس ہفتہ "ہمدرد" نہیں مل سکا تھا، اور غلطی سے میاں یوسف نے اسے یہاں بھیجا بھی نہیں۔ البتہ گذشتہ دو ہفتوں کی ڈاک کُک کے ہاں سے آگئی ہے اور جس ہفتہ کی ڈاک میں آپ کا خط آیا ہے اُس کے اخبارات انشاء اللہ کل آجائیں گے ممکن ہے کہ یوسف صاحب بھی چھوٹی ہوئی ڈاک کے "ہمدرد" کل تک بھیجدیں۔ شروع سے آخر تک پڑھتا ہوں ایک دن یا ڈیڑھ دن ہمدرد پڑھنے کی نذر ہو جاتے ہیں اور ایک دن یا ڈیڑھ اس کو خط لکھنے میں۔ اس لئے یہ نہ سمجھئے کہ یہاں "ہمدرد" سے میرا تعلق کسی طرح کم ہو گیا ہے سب کو سلام شوق۔

آپ کا دور افتادہ مریض بھائی

محمد علی

ابھی صبح کے ساڑھے پانچ بجے ہیں حنیف صاحب کے لڑکے عبدالعلی
صاحب نے ابھی وضو کرایا تھا وضو کر کے نماز فجر ادا کی اور خدا کا شکر ادا کیا کہ
اُس نے اتنی اصلاح فرمادی ہے اب بفضلہٖ تعالیٰ پاؤں کی انگلی کا انگور بن گیا ہے
ذرا کھال ابھی کچی ہے، یا پوری طرح نہیں بنی ہے مگر انشاء اللہ جمعہ تک بالکل
اچھی ہو جائے گی، اور خدا نے چاہا تو اس دن میں رخصت بھی ہو سکوں گا۔ ابھی
مختلف غذائیں کھلا کھلا کر اور مختلف اوقات میں قارورہ لے کر ڈاکٹر میری حالت
کا اندازہ کر رہا ہے میں نے پچھلے خط میں لکھا تھا کہ منگل کے دن، یعنی ۱۲ر
اگست کو میرے پاؤں کا X. RAYS کے ذریعے سے فوٹو لیا گیا تھا۔ خدا کا شکر
ہے کہ پاؤں کی انگلی کی ہڈی تک بال بال بچ گئی اور اس پر گینگرین کا اثر ہونے
نہیں پایا۔ اب میں گذشتہ اتوار سے چند گھنٹے روزانہ آرام کرسی پر بیٹھ لیتا ہوں
زخمی پاؤں سامنے ایک کرسی پر تکیہ رکھ کر پھیلا دیا جاتا ہے کھانے کو اب صبح
کو دو انڈے ایک بھوسی کی روٹی کا کچا توس، کچھ مکھن کچھ ذیابیطیسی جو مزے
میں بالکل معمولی جیم کی طرح ہوتا ہے اور چائے کی تین پیالیاں ملتی ہیں یہ صبح
کے ساڑھے آٹھ بجے تک مل جاتا ہے اس کے بعد دس بجے جرمن لوگ دوسرا
ناشتہ کھایا کرتے ہیں اس میں مجھے دو آڑو یا دو ناشپاتیاں ملا کرتی ہیں ڈیڑھ

بجے کے تقریب لنچ ہوتا ہے جو در اصل ڈنر ہے۔ آجکل اس میں سوپ ملتا ہے۔ مرغی، گوشت، ترکاری اور سلاد ملتا ہے اور پھل گذشتہ اتوار کو ICE CREAM (برف) بھی ملی تھی، اور اُس کے ساتھ ایک کیک بھی مگر یہ سب چیزیں ذیابیطسی شکر یعنی سیکرین سے تیار کی جاتی ہیں اور یہاں کی قسم سیکرین سے بہتر میں نے آج تک کوئی سیکرین نہیں دیکھی۔ چار بجے چائے ملتی ہے اور اس کے ساتھ ہی بھوسی کی روٹی کا ایک کچا توس، اور ایک ڈبل روٹی جو پاپڑ سے بھی ہلکی اور "بھادار" ہوتی ہے اور کچھ مکھن اور کچھ پھل پھر آٹھ بجے رات کو ڈنر DINNER یا سپر SUPPER ملتا ہے پہلے تو صرف سلاد یا ترکاری اور پھل ہوا کرتے تھے، یا پنیر اور ذیابیطسی ڈبل روٹی، مگر اب دو تین دن سے رات کو بھی گوشت یا مچھلی یا ترکاری ملتی ہے اور پھل پیٹ بھر سے زیادہ مل جاتا ہے میں نے تو ڈاکٹر صاحب سے کہا تھا کہ اگر اجازت ہو تو تھوڑا سا چھوڑ دیا کروں مگر حکم ملا کہ ابھی طاقت بڑھانا چاہیئے، کھائے جاؤ، بہرحال خدا کا شکر ہے کہ اب تک شکر کا نام نہیں ہے۔ نہ معلوم یہ پیر میں درد کیسے پیدا ہوا اور آبلہ کیوں پڑا۔ ورنہ میں تو اب تک اسی کا قائل ہوں کہ پھل سلاد کھانے اور فاقہ کرنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ اب تک اس قدر کھانے پر بھی جبکہ ورزش کیا، حرکت تک بند ہے، شکر مطلق نمودار نہیں ہوئی۔ گذشتہ پیر کے دن یعنی ۲۷ اگست کو گردوں کا امتحان اس طرح کیا گیا کہ ۷ بجے علی الصبح بغیر دودھ اور بغیر سیکرین کے ہلکی چائے کی چھ پیالیاں پلا دی گئیں اور قارورہ لیا گیا، اور پھر آٹھ بجے قارورہ لیا، اور بھوسی کی روٹی کے دو کچے توس اور ذرا سا مکھن کھانے کو ملا پھر نو بجے قارورہ لیا گیا، اور پھر دس بجے، پھر ایک گلاس دودھ پینے کو ملا پھر گیارہ بجے قارورہ لیا گیا، پھر ۱۲ بجے، پھر ایک بجے پھر کچھ گوشت اور ترکاری کھانے کو ملی، پھر تین بجے قارورہ لیا گیا، پھر پانچ بجے، پھر سات بجے، پھر تھوڑی

سی روٹی اور مکھن ملا، اور صبح کے ۸ بجے تک قارورہ لیا گیا اور اس کے بعد جاکر کہیں پانی پینے کو ملا۔ پرسوں سے ایک اور آفت کا سامنا کرنا پڑا تھا یعنی بائیں پاؤں میں ایک سخت تیز درد کی سی چمک ہو جاتی تھی کل تین بار ایک دوا پلائی گئی مگر رات کو اس قدر تکلیف ہوتی تھی کہ اندیشہ تھا نیند ہی نہ آئے، اس لئے چھوٹے ڈاکٹر نے دو گولیاں خواب آور احتیاطاً دے دی تھیں کہ اگر نیند نہ آئے تو کھا لینا الحمد للہ کہ نیند خوب آگئی اور گولیوں کی ضرورت نہیں پڑی، صبح کو اٹھا ہوں تو درد کا پتہ نہیں مجھے تو اندیشہ ہونے لگا تھا کہ کہیں اس پیر میں بھی آبلہ نہ پڑ جائے اور شگاف نہ دلوانا پڑے، مگر اب جاکر خداوند کریم نے اطمینان نصیب کیا ہے ڈاکٹر برابر یہی کہتا تھا کہ یہ کوئی اندیشہ ناک بات نہیں ہے مگر دودھ کا جلا ہوا چھاچھ کو بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے اچھا اب رخصت ہوتا ہوں گذشتہ ہفتہ کی ڈاک بدھ کے دن ۲۲ اگست کو گئی تھی۔ اسی کے بعد سے غذا میں بتدریج ترقی شروع کی گئی تھی اسی دن سے تھوڑا تھوڑا سا نمک ملنا شروع ہوا ہے اور مچھلی مرغی اور دوسری قسم کا گوشت رفتہ رفتہ دیا جانا شروع ہوا ہے اب تک یہاں کوئی پچیس پونڈ صرف ہو چکے ہیں اور لطف یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی فیس قارورہ اور خون کے امتحان اور X-ray کے فوٹو کے مصارف کا بل ابھی تک آیا بھی نہیں ہے۔ اس ہفتہ غالباً پندرہ پونڈ صرف ہوں گے[1]۔

---

[1] بیگم صاحبہ کے نام خط

(۱۷)

غسل میت سے غسل صحت

فان نارڈین کا مطب۔ فرینکفرٹ (جرمنی)

یکم ستمبر ۱۹۲۸ء

پیارے عرفان خداوند کریم تم پر اپنے افضال نازل فرماتا رہے اور تمہیں ہمیشہ اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ تم سے بیحد شرمندہ ہوں کہ غالباً ۱۲ر جولائی کے بعد سے تمہیں ایک خط بھی نہیں لکھا، اور ۱۶ر جون کو یورپ پہنچکر کوئی خط لکھا تو وہی ۱۲ر جولائی والا ایک خط۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ علاوہ اس مختصر سے خط کے جو میں ہر ہفتہ بیگم صاحبہ کو لکھا کرتا ہوں، میں ہفتہ میں ایک ہی مفصل و مشرح خط لکھ سکتا ہوں اور چونکہ "ہمدرد" میں وہ شائع ہو جایا کرتا ہے، اس لئے وہ خط تمام اعزہ و اقارب اور تمام دوست احباب کے نام ہی کا ہوتا ہے۔ اور جو خط ۱۲ر جولائی کو میں نے تمہیں لکھا تھا مجبوراً اس کو بھی "ہمدرد" والوں ہی کے پتہ سے بھیجدیا کیونکہ اس ہفتہ کوئی اور مفصل خط نہ لکھ سکا۔ اس وقت شام کے چھ بجے ہیں اور میں اس پرائیویٹ مطب میں جو ذیابیطس کے علاج کے ماہر نہ گیا لم رائٹ (علامہ فن طب) فان نارڈین کا ہے (مگر جس کے رہنے، کھانے اور تیمارداری اور دوا وغیرہ کے انتظامات ایک کمپنی کے سپرد کئے گئے ہیں۔ صرف علاج کی فیس وہ خود دیکر لیتے اور اپنے رفقار کار اور اسسٹنٹوں کے درمیان تقسیم کر لیا کرتے ہیں) نمبر ۲۲ کے کمرہ میں بستر پر بیٹھا ہوا یہ خط تمہیں لکھ رہا ہوں آج پہلا دن ہے کہ غسل کی اجازت ملی ہے اور گو ہر روز ایک کپڑے کو تر کر کے اور اس پر صابون لگا

کر سارے بدن کو، سوائے زخم خوردہ سیدھی ٹانگ کے، ایک قسم کا "غسل" یہاں کا غسال دے دیا کرتا تھا، پھر اس کپڑے کو دھو کر بدن سے صابون چھڑا دیا کرتا تھا، اور اسکے بعد اسی کپڑے کو گیلا کرکے اس پر الکحل ڈالکر جسم کو اور بھی صاف کر دیا کرتا تھا۔ ورہ جانگوں میں اور پیٹھ پر پوڈر مل دیا کرتا تھا تاکہ پسینہ کے باعث بدبو پیدا نہ ہو جائے یا بستر پر پڑے پڑے رگڑ کر زخم نہ پیدا ہو جائے۔ تاہم کہہ نہیں سکتا کہ معمولی غسل کے بغیر طبیعت کس قدر بیزار تھی۔ الحمد للہ کہ آج پانچ بجے ایک بڑے ٹب میں لیٹ کر گرم پانی اور صابون سے خوب دیر تک میل چھڑاتا رہا، پھر لوٹے بھر بھر کر، نیم گرم اور سرد پانی ڈالا، اور "پاک ہوا"۔ مگر ابھی تک چونکہ سیدھے پاؤں کی بیچ کی انگلی میں آبلہ پڑ گیا تھا کھال پوری طرح نہیں بن پائی ہے اسلئے وہ پاؤں پانی سے باہر ہی رکھا گیا۔ سارے جسم کی طہارت اور صفائی کے بعد پرمنگنیٹ آف پوٹاش ڈالکر ایک فٹ باتھ FOOT BATH یعنی دو بالشت کے ٹب میں اسی قدر گرم پانی میں جس قدر گرم میں جسم تھا، زخمی پاؤں کو بھی غسل دیا گیا۔ اس پاؤں کا غسل دو دن سے جاری ہے، مقصد بلا تکلیف کے پرانی زخمی کھال کو دور کرنا تھا تاکہ نئی کھال نکل آئے اور میل کچیل کے باعث زخم بگڑنے نہ پائے۔

۲۳ اگست کو لندن سے غسل کرکے چلا تھا ۱۸ دن کے بعد آج غسل نصیب ہوا ہے۔ ۱۷ کی دوپہر سے صاحب فراش ہوں اور گو ۲۶ اگست سے چند گھنٹہ آرام کرسی پر بیٹھنے کی اجازت مل گئی ہے البتہ زخمی پیر کے سامنے ایک کرسی رکھ کر اور اس پر نرم تکیہ رکھ کر تکیہ پر پھیلا دیا جاتا تھا۔ تاہم چونکہ انگلی کے نیچے حصہ میں نئی کھال بننا شروع ہو گئی تھی مگر اوپر کے حصہ کی موٹی کھال مشتبہ تھی اور ڈاکٹر کا گمان تھا کہ اس کے نیچے کچھ مواد باقی ہے اسلئے نیچے کے حصہ کو دوا لگا کر اور اس پر اسٹکنگ STICKING نوور سے باندھکر تاکہ پانی اس تک نہ پہنچنے پائے، اوپر کے حصہ پر گرم پانی میں کپڑا تر کرکے

بطور ہاٹ کمپرس HOT COMPRESS کے باندھ دیا گیا تھا، اس لئے زیادہ زور سے نیچے کے حصّہ کے بند ھنے کا نتیجہ ہوا کہ ساری ٹانگ بھاری پڑ گئی، اور مجبور ہو کر اوپر کے حصّہ کا کمپرس کھول دیا گیا اور نیچے کے حصّہ کا بندھن بھی دور کر دیا گیا، اور ویسلین لگا کر ہلکی سی پٹی باندھ دی گئی، اور دوسرے دن سے فٹ ہاتھ شروع کر دئے گئے۔ اس ٹانگ کے بھاری پڑنے سے پھر خائف ہو کر میں نے کرسی کو دور ہی سے سلام کیا۔ اور پھر بستر پر دراز ہو گیا۔ وہ دن اسی بیم و رجا میں گذار رہے، مگر آج الحمدللہ اس قابل ہو گیا کہ کرسی پر بھی بیٹھ سکوں اور غسل بھی کر سکوں اگرچہ ایک ذیابیطسی کے لئے ایک چیونٹی کے کاٹنے اور کھال میں سر سوزن سے باریک تر چھید ہو جانے سے ملک الموت کے لئے پھاٹک کھل جاتا ہے اور جب تک پٹی بالکل نہ کھل جائے نہیں کہہ سکتا کہ پاؤں کی ایک انگلی کو بھی صحت نصیب ہو گی (چہ جائیکہ مرض ذیابیطس سے نجات مل گئی اور اعصابی سوزش بھی جو اب تک بدستور جاری ہے، بند ہو گئی) تاہم اس غسل کو غسل صحت کہوں تو شاید قبل از وقت خوشی اور اطمینان کا اظہار نہ سمجھا جائے۔ پیارے عرفان! عظمت علی بھیا (بیگم صاحبہ اور عظیم صاحب کے والد مرحوم) کے ٹھیک اسی عمر میں اور ٹھیک اسی جگہ ایک پھنسی نکلی تھی، مگر نشگاف لگائے جانے کے بعد ذیابیطسی خون میں اندمال کی قوت نہ پائی گئی اور یہ گوشت بنتا تھا اور کاٹا جاتا تھا، انگور نہ بننے پاتا تھا (چہ جائیکہ نئی کھال بھی بن جائے) اور پھر کچھ دن میں ایک اور پھنسی نکلی جس کو وائسرائے لارڈ ہارڈنگ کے خاص سرجن سرجمیس نے نشگاف دیا، اور تہجد کے وقت عین اسی دن جس دن کہ میرے والد مرحوم نے انتقال فرمایا تھا (یعنی ۱۷ رمضان المبارک روز بدر اور یوم الفرقان) رخصت ہو گئے۔ اس ذیابیطس کی بدولت میں بار بار اس بستر مرض پر پڑ چکا ہوں جو بہت آسانی سے بستر مرگ ہو سکتا ہے اسلئے جس طرح مکہ معظمہ میں موتمر عالم اسلام کے دو بجے ہی اجلاس کی صبح کو میں نے سمجھ لیا تھا کہ اب چلنے کی تیاری ہے اسی

طرح اس بار بھی اپنا یہ شعر پڑھکر دنیا کو چھوڑنے پر راضی ہو چلا تھا کہ ؎

تو جو آمادہ ہو اے دل تو ہے پھر وا بھی ہیچ
آشنا دیکھو یہ سب کھیل ہے نسیانی کا

البتہ فرق اتنا تھا کہ کہاں اللہ کے گھر کی موت اور کہاں اس کفرستان کی ؟ خیر غالب کا شعر یاد آگیا تھا کہ ؎

مارا دیار غیر میں ہم کو وطن سے دور
رکھلی مرے خدا نے میری بیکسی کی شرم

ارادہ تھا کہ اپنے ہموطن اور علیگڈھ کے کلاس فیلو حنیف خان کے صاحبزادے عبدالعلی اور ظفر عمر کے صاحبزادے شوکت عمر، اپنے شاگرد و مرید اشرف اور اپنے زمانہ کے علیگڈھ کے اولڈ بوائے محمد امین فقیہہ (سابق جج جوناگڈھ) کے صاحبزادے اور عبدالرحمٰن صدیقی کے بھانجے، خالد کو غسل میت اور نماز جنازہ سکھا دوں تاکہ ضرورت پڑے تو یہ فرض کفایہ ادا ہو سکے جب حالت یہ ہو (حالانکہ لکھنے کو پاؤں کی ایک انگلی میں آبلہ پڑا تھا، جسے آدھے سکنڈ میں ایک خفیف سا شگاف دے دیا گیا) تو پھر کیوں نہ کہوں کہ اس بیم کے بعد ؎

موت ہی سے کچھ علاج درد فرقت ہو تو ہو
غسل میت ہی ہمارا غسل صحت ہو تو ہو

کیوں نہ سمجھوں کہ آج میں نے غسل صحت کیا ۲۲ بجے وہاں سے فارغ ہو کر اپنے کمرہ میں لایا گیا اور اسی وقت دوگانۂ شکر ادا کیا پھر نماز عصر پڑھی، اور تم پہلے شخص ہو جسے یہ خوشخبری پہنچاتا ہوں۔ ابھی بیگم صاحبہ تک کو ایک حرف نہیں لکھا ہے (اور حقیقتاً ان کو ان کے گذشتہ مسلسل چار پانچ خطوط کے اندار تحریر کی ایک حد تک سزا دینا بھی مقصود ہے) (یہاں تک اس دن خط لکھ کر لیٹے رہا تھا، اب اسے ۵ ستمبر کو ختم

کرتا ہوں اس لئے کہ ڈاک آدھ گھنٹہ میں چلی جائے گی۔)

پیارے عرفان۔

میں نے غالب کا دیوان خدا جھوٹ نہ بلوائے تو سینکڑوں بار پڑھ ڈالا ہوگا، اور ہزاروں لاکھوں بار اسکے مختلف اشعار پڑھے ہیں اور لوگوں کو سنائے ہیں اور خود اپنا دل بہلانے کو اس پھٹی ہوئی آواز میں گنگنائے بھی ہیں۔ مگر ایک شعر کا مطلب، جسے ہزاروں بار پڑھا، سنایا اور گنگنایا ہے آج جاکر سمجھ میں آیا ہے۔ خدا اشاہد ہے کہ آجتک نہ سمجھا تھا کہ غالب نے یہ شعر خاص اپنے اس عاشق زار ہی کے لئے لکھا تھا وہ شعر یہ ہے ؎

ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبرد عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

میرے پاؤں کا جو کچھ حال اب تک تم نے پڑھا ہے، اور ملفوفہ تصاویر سے جواب نظر بھی آجائے گا اسکے بعد یہ سمجھنا تو ذرا بھی مشکل نہ ہوگا کہ مجھ سے بھاگا کیوں نہیں جاتا۔ مگر جب یہ سنو گے کہ اس پرائیویٹ شفاخانہ میں صرف کمرے، کھانے اور نرسنگ (تیمارداری) کے روزانہ ایک پونڈ ۵ شلنگ (یعنی سترہ روپیہ) دینا پڑتے ہیں اور ادویہ اور خون وغیرہ کے امتحان کے اور عکس ریز سے پاؤں کی ہڈیوں کے فوٹوگراف کے اور ریڈیم سے غسل کے (جو پرسوں پہلی بار ملا تھا، اور آج شام کو پھر ملیگا اور اعصابی سوزش پہلی بار تو یقیناً کم کر چکا ہے اور جس سے بڑی توقعات ہیں) اور ڈاکٹر صاحب کے علاج و مشورہ کے (جس کے متعلق ابھی اندازہ تک نہیں کیا جاسکتا اور جس کی بل ابھی تک نہیں آئی ہے اور جس کے باعث پلنگ پر پڑے پڑے لرزا کرتا ہوں) اخراجات ان سب کے علاوہ، اور پھر اپنے تیماردار عزیزی عبدالعلی صاحب کے کھانے پینے کے اور اپنے کپڑوں کی دھلائی اور حجامت

وغیرہ کے اخراجات اور چلتے وقت کے انعامات، تو تمہاری سمجھ میں بھی آجائے گا کہ مجھ سے یہاں "ٹھہرا" بھی کیوں نہیں جاتا۔ ابھی تین ہفتہ ہوئے بھی نہیں ہیں اور بل صرف دو ہفتہ کے ادا کئے ہیں اور وہ بھی سب نہیں، مگر اس وقت تک پچاس پونڈ صرف ہو چکے ہیں، اور یہ ان بیس پونڈ کے علاوہ ہے جو چلتے وقت لک سے نکلوا کر لے آیا تھا۔ اب صرف اتنا باقی ہے کہ یہاں کا اس ہفتہ کا کرایہ وغیرہ ادا کر کے تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لیکر لندن پہنچ جاؤں۔ نہ ڈاکٹر کی فیس کے لئے کچھ باقی ہے، نہ اور مصارف کے لئے اور ابھی تقریباً ایک ماہ دس دن یورپ میں گذارنا ہے اور دو ڈھائی ہفتہ جہاز پر۔ یہ سب سن چکے، اور پھر سنو کہ غالب نے لسان الغیب بنکر میرے لئے یہ شعر لکھا تھا

ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبرد عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے، نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

اب میری صحتیابی کی داستان کا بقیہ حصہ بھی سن لو۔ "غسل صحت" کے دوسرے دن چھ گھنٹہ کے لئے نیچے کی منزل پر انولیڈس چیر (INVALID'S CHAIR) (مریضوں کی کرسی) کے ذریعہ میوزک سیلون (غنا خانہ) میں گیا اور ایک نیم روسی، نیم ترک یہودن صاحبہ کا جن سے یہاں ملاقات ہوگئی ہے کسی قدر گانا اور زیادہ تر پیانو بجانا جس کا انہوں نے ڈپلومہ حاصل کیا ہے سنا۔ تیسرے دن دوپہر کو گھنٹہ بھر کے لئے پہلی بار اس شفاخانہ سے ٹکسی پر جاکر شہر کی سیر کی اور شام کو پیڈیم کا غسل لیا جس سے ۲۴ گھنٹہ تک پیروں میں اعصابی سوزش بند رہی۔ کل یہاں سے کوئی دس پندرہ میل کے فاصلہ پر ٹکسی میں باوہمبرگ جاکر دیکھا، جہاں مشہور طبی پینے اور نہانے کے چشمے ہیں۔ اور لطف یہ کہ وہاں قیصر جرمنی کے صاحبزادہ شہزادہ آڈیلبرٹ اور اُن کی شہزادی اور بچوں سے ملاقات ہوگئی اور دیر تک گفتگو ہوتی

رہی مگر اب وقت بالکل نہیں ہے اس لئے خط بند کرتا ہوں۔ اگلے خط کا انتظار کیجئے۔

سب کو سلام شوق

تمہارا چاہنے والا
محمد علی

(۱۸)

مراجعت وطن

پیارے زاہد۔ السلام علیکم و رحمت اللہ و برکاتہٗ

تمہارا خط اسی ڈاک میں ملا۔ سو دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی، ارادہ تھا کہ اس ہفتہ کا مفصل خط تمہارے نام لکھوں اور تم سے درخواست کروں کہ تم اسے "ہمدرد" کو بھی ارسال کر دو تاکہ سب اعزہ و احباب کے لئے وہی کافی ہو مگر اس ہفتہ کسی کو بھی مفصل خط لکھنے کی فرصت نہیں ملی۔ اور آج جمعرات کو شب کے ساڑھے سات بجے جبکہ معمولی ڈاک بڑے ڈاک خانہ میں ۲ ر کا زیادہ ٹکٹ لگانے پر آدھ گھنٹہ بعد نہ جا سکے گی یہ مختصر سا خط گھر سے لکھ رہا ہوں اور ہوائی جہاز سے روانہ کرا دوں گا اور پھر کھانا کھا کر سامان باندھوں گا۔ تاکہ کل رات کو در نہ پرسوں صبح اس ملک کو آخری سلام کہہ کر رخصت ہوں۔ اس ہفتہ فرصت نہ ملنے کی وجہ یہ ہوئی کہ اوّل تو جمعہ کو مسز نیڈو اس ملک میں وارد ہوئیں اور ہفتہ کو اُن سے ملا اور اُن کے اعزاز میں کانگرس کمیٹی نے جو دعوت دی اس میں شریک ہوا اور زبردستی بولنا پڑا، حالانکہ اس دن میرے فاقہ کو پورے بارہ روز ہو چکے تھے۔ یہ میرے ڈاکٹر کی آخری کوشش تھی، میری طبیعت یوں تو اچھی رہی اور ہر شخص کو مجھے چلتا پھرتا دیکھ کر مسرت ہوتی تھی لیکن اعصابی حالت اب تک پوری طرح درست نہیں ہوئی یعنی پاؤں کے تلووں میں احساس کی کمی بدستور رہے گو سوزش اب اس طرح نہیں ہوتی جس طرح دہلی میں ہوتی تھی اور مزے کی نیند سوتا ہوں دوسرے مظفر کے بدلے کپڑے جلد جلد کپڑے تیار کرائے اس میں مصروف رہا، انشاء اللہ

ہفتہ کو ہم لوگ پیرس جائینگے۔ دو دن وہاں رہ کر رُڈف بے اور مہاراجہ سے مل کر
برلن جائینگے۔ فرنکفرٹ، فرائی برگ ہوتے ہوئے ویانا جائینگے تاکہ مظفر کے داخلہ
کا انتظام ہو جائے! اگر روم جانا ہوا تو وہاں سے میں روم جاکر برنڈیزی سے
قسطنطنیہ کو چل دونگا، اور شام فلسطین، مصر اور پھر عراق کے راستہ سے
کراچی آؤنگا یا عراق کو چھوڑ کر مصر ہی سے بمبئی آؤنگا۔ اگر روم جانے کا حکم نہ ملا
تو ویانا ہی سے سیدھا براہ خشکی قسطنطنیہ چلا جاؤں گا۔ اچھا اب رخصت ہوتا
ہوں۔ طارق کو دیکھنے کو بے قرار ہوں۔ اس کے لئے ایک ہوائی بندوق لانے
کا خیال ہے۔

تمہارا چاہنے والا
محمد علی

سفرِ آخری

نومبر ۱۹۳۰ء

گول میز کانفرنس کی شرکت

"شدّ رحال[1] اب تو میرے مذہب میں گول میز کانفرنس ہی کی شرکت کے لئے جائز رہ گیا ہے۔"

محمد علی
۲۰ ستمبر ۱۹۳۰ء

---

[1] ایک مشہور حدیث ہے کہ زیارت کے لئے شدّ رحال (اونٹ پر کجاوہ باندھنا یعنی سفر کرنا) خانہ کعبہ اور بیت المقدس کے سوا کہیں اور کے لئے جائز نہیں۔ یہاں شدّ رحال کا اشارہ اس حدیث کی طرف ہے۔

عزمِ سفر

پاؤں میں پہلے ہی حس نہ تھا، اب حالت کچھ بدتر ہی ہے

اور سردیوں میں ہر وقت گنگرین اور . . . . . .

. . . . . . یا اُن کی قطع و برید اور اسی طرح موت کا اندیشہ

رہیگا۔ جس سے ڈاکٹر انصاری کے مرحوم و مغفور منجھلے بھائی صاحب

کو دوچار ہونا پڑا۔

"اب تک صاحب فراش ہوں۔ کانفرنس کے روزانہ اجلاس

میں نہ صرف ہندوؤں اور انگریزوں بلکہ سب سے زیادہ خود مسلمان

بھائیوں سے ایک ایک نقطہ پر جنگ کرنی پڑے گی۔ ان تین محاذوں

پر جنگ کرنے میں ہر وقت دل کی حرکت یکایک بند ہو جانے کا

اندیشہ ہے۔ سب سے زائد یہ کہ اب لکھ پڑھ نہیں سکتا۔ کامل نابینائی

کا ماہر علاج چشم نے پورا یقین دے دیا ہے کہ اگر میں سب کام چھوڑ

کر نینیال جیسے ملک کو نہ چلا جاؤں، جہاں دنیا کی کوئی خبر نہ ملے لیکن اس

پر بھی میں سمجھتا ہوں کہ میرا مذہبی فرض ہے کہ اس کانفرنس میں شریک

ہوں اور وہاں سلطان جابر اور رعایائے جابر دونوں کے سامنے

کلمۂ حق کہہ کر سب سے افضل جہاد کروں تا آنکہ اس کام میں مر جاؤں۔ اس لئے قرض دام لیکر، بھیک مانگ کر۔ اور جس طرح بھی ہو سکے گا تین چار ہزار روپیہ فراہم کر کے اپنی اہلیہ کو بھی ساتھ لے چلوں گا۔ اس لئے کہ وہ زندگی کی ساری منازل و مراحل میں میری رفیق سفر رہی جب منزل مقصود کے لئے احرام سفر باندھوں تو چاہتا ہوں کہ وہ موجود ہو۔ ورنہ لندن کا بدترین موسم ہے اور ہر متمول انگریز اور مقیم انگلستان چھوڑ کر دوسرے ملکوں کو بھاگ جاتے ہیں"

۲۰ ستمبر ۱۹۳۰ء

(۱)

پیرس میں شدید علالت

پیرس (اسپلنڈر ہوٹل)

۶ نومبر ۱۹۳۰ء

پیاری زھرہ

خداوندکریم تجھے اور طارق کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔

آج ہندوستان سے چلنے کے ایک ماہ اور دو دن بعد میں پہلی بار تجھے یہ خط اپنے ہاتھ سے لکھ کر بھیج رہا ہوں تاکہ تو اور سب عزیز و اقارب اور دوست احباب مطمئن ہو جائیں کہ خداوند کریم کے فضل سے میں نے دوبارہ زندگی پائی۔ حقیقتاً جو دھچکا مجھے اس بار لگا وہ سب سے زیادہ سخت تھا۔ باوجودیکہ یہ جگہ شملہ کی طرح سطح سمندر سے اونچی نہ تھی تاہم خون کا دباؤ بالکل شملہ کی طرح ۱۹۰ سے اوپر ہو گیا تھا اور لیٹنا سانس کے باعث ناممکن ہو گیا تھا۔ بھوپال میں بھی ابتدائے ستمبر میں بمبئی سے واپسی پر خون کا دباؤ یکایک اس طرح بڑھ گیا تھا مگر سانس کی یہ حالت نہیں ہوئی تھی۔ اس بار سب سے زیادہ تکلیف دہ بخار، جگر کا بڑھ جانا اور اس میں درد پیدا ہو جانا، بھوک کا بالکل غائب ہو جانا، متلی کا بار بار ہونا، اور صفرے کی عجیب و غریب زیادتی جس کے باعث پانچ دن تک غذا بالکل ہضم نہ ہو سکی اور اس طرح ایک طرف تو ضعف اور دوسری طرف صفرے سے کشتی لڑنا یہ سب کچھ ہوا۔ شملہ میں مرض کا پہلا

سخت حملہ تھا اور بدن میں مقابلہ کی قوت تھی بھوپال میں بمبئی سے واپسی پر حملہ
اس قدر سخت نہ تھا مگر اب بدن میں جان نہ تھی۔ یہاں تو کچھ نہ پوچھو کہ کیا گذری۔
خدا تیری بی کا بھلا کرے۔ رات دن میرے قریں سفر تھی اور مجھے اطمینان قلب
حاصل تھا۔ خدا بھلا کرے میرے مصری اور ترک دوست ڈاکٹر بہجت وہبی کا
جنہوں نے بہتر سے بہتر ماہرین علاج قلب و معدہ سے میرا علاج کرایا اور صبح
و شام خود بھی اس میں مصروف رہے جو امداد اُن سے ملی ساری عمر میں کسی سے
نہیں ملی۔ ان کے لئے دعا نکلتی ہے ان سے زیادہ اچھا اور سچا مسلمان میں
نے آجتک نہیں دیکھا اور ان کا عشق میرے دل میں پہلی بار سندہ پورہ میں
جاگزین ہوا تھا جسے اب کوئی پچیس برس ہوئے ہونگے جب میں نے مدارس
کے ایک اسلامی اخبار میں اس مضمون کی نقل پڑھی جو انہوں نے انگلستان
کے مشہور رسالہ انیسویں صدی اور مابعد Nineteenth
Century & After میں Pan Islamism یعنی اخوت
اسلامی پر لکھا تھا۔ اقبال سے بھی پہلے میں نے اپنے اسلامی خیالات کا نقشہ
ان کے اس مضمون میں دیکھا تھا اس سچے مسلمان پر جو ڈاکٹر انصاری کی طرح
ایم۔ڈی کی ڈگری انگلستان سے لے چکا ہے اور جو مصری حکومت میں جنگ
سے پہلے Anatomy یعنی علم التشریح کا پروفیسر تھا۔ اس کے
اسلام اور اسکی علمی اور عملی قابلیت کے باعث جو کچھ گذر رہا ہے وہ ایک بڑی
داستان ہے اور جس طرح وہ آج پیرس میں ایک جلاوطن کی زندگی گذار رہا
ہے اور روال روٹی کھا رہا ہے وہ بھی ایک داستان سے کم نہیں۔ انشاء اللہ
کبھی یہ سب داستان دہرائی جائے گی۔ آج وقت نہیں جب میں ۱۹۲۰ء
میں وفد خلافت کو لیکر آیا تھا تو میرے ترک دوست اسعد فواد بے اور

میری مصری دوست زیبا خانم اسعد کی بیگم صاحبہ کے ساتھ یہ سوئٹزرلینڈ میں رہتے تھے۔ پہلی بار ان تینوں دوستوں سے وہیں ملاقات ہوئی تھی جب ۱۹۲۹ء میں مہاراجہ صاحب الور کی فیاضی اور قدر افزائی کے باعث میں یورپ کو پھر علاج کے لئے آیا تو ڈاکٹر وہیی نے مجھے یہاں کے ایک ماہر معالج ذیابطیس کو بھی دکھایا تھا۔ جب جرمنی جانے وقت پیرس ہی میں بیمار ہو گیا تھا تو انہیں نے دیکھا بھالا تھا اور فرینکفرٹ روانہ کرایا تھا۔ واپسی میں مظفر اور میں اسی ہوٹل میں جہاں یہ رہا کرتے ہیں اسی کمرہ میں ٹھہرا تھا۔ جہاں اب بیماری کے باعث بی اور میں پھر رہتے ہیں۔

جہاز پر تو میں آنکھوں سے اندھا تھا اور قلب کی حالت بھی خراب تھی۔ البتہ عدن پہنچتے تک طبیعت درست ہو گئی تھی۔ وہاں جہاز سے اترنا چڑھنا اور اپنی مرید بی خیر النساء اور حسین بھائی کے لائے ہوئے کھانے میں سے ذرا سا چکھ لینا بھی مضر ثابت ہوا اور دو دن بعد اس کا اثر محسوس ہوا مگر دو چار روز بعد طبیعت پھر سدھر گئی۔ میں شوکت صاحب، زاہد اور بی کے ساتھ قاہرہ تو اس بار نہ جا سکا مگر پورٹ سعید میں بیت المقدس سے آکر حضرت مفتی اعظم ابن الحسینی صاحب مجھ سے جہاز پر مل گئے اور ان کے سیکرٹری اور ہمارے مؤتمر عالم اسلام منعقدہ مکہ معظمہ کے ترجمان عجاج صاحب قاہرہ جاکر شوکت صاحب سے مل آئے اور انہیں کے ساتھ واپس آکر مجھ سے بھی مل لئے۔ قاہرہ جانے کی مجھ میں طاقت نہ تھی۔ البتہ تین دن بعد مالٹا پر اتر کر میں نے اس جگہ کو دیکھا جہاں ہمارے سردار حضرت شیخ الہند محمود الحسن صاحب رحمتہ اللہ علیہ ہمارے رفیق مولانا حسین احمد صاحب اور عزیر گل صاحب وغیرہ مریدوں اور شاگردوں کے ساتھ قید کر دئے گئے تھے۔ اس میں نکان ضرور محسوس ہوئی

گو میں موٹر سے بالکل نہ اترا تھا اور صرف ایک گھنٹہ اس میں گھوما تھا۔ مارسیلز میں اکرم روحی بے اور ان کے ساتھ ہی حضرت محمد رشاد خلیفۃ المسلمین مرحوم کے صاحبزادے جو اپنی والدہ ماجدہ کے ساتھ نیس میں رہتے ہیں ملے۔ شعیب صاحب سے ملنے آئے تھے ہم اسی دن پیرس کو چلے گئے اور گو راستہ لمبا تھا اور راستہ بھر اپنی ٹوٹی پھوٹی گیا، دس بارہ لفظ کی فرانسیسی زبان میں اپنے کمرے کے مسافروں کو سمجھانا پڑا کہ پہلے ہم گاندھی جی کے ساتھ مل کر کس طرح کام کرتے تھے اور اب کیوں مسلمانوں کی حق تلفی سے پریشان ہو کر ان کے حقوق کی حفاظت کے لئے اس تحریک سے علیحدہ ہیں، مگر ہندوستان کی آزادی کے لئے آواز بلند کرنے لندن جا رہے ہیں جس کے باعث مجھے آرام کم ملا تاہم شام کو پونے گیارہ بجے ہم بخیریت پیرس پہنچ گئے اور ڈاکٹر وہبی اور شوکت اللہ شاہ کو اسٹیشن پر پایا۔ رات کو آرام سے سویا صبح کو غسل کیا، ناشتہ کیا اور بی کے لئے چند ضروری چیزیں خریدنے بازار گیا یہاں سے بیسیوں گنی بڑی دکانیں تین چار بجے مشہور ہیں WHITE WAY۔ ان میں سے ایک میں سب چیزیں مل گئیں مگر مجھ پر یہ محنت سخت گذاری اور بھوک سے بیتاب ہو گیا۔

ایشیائی کھانے کی تلاش میں ایک ارمنی دوکان میں گیا جہاں گوشت حلال ملتا ہے، خدا نے تمہاری بی کو بے حلال کئے ہوئے گوشت سے اب تک بچایا ہے اور انشاء اللہ ہم لندن میں بھی اس سے محترز رہیں گے اس دوکان میں پہلی چیز جو ملی وہ طولمہ (دولمہ) تھے، مگر مجھے پسند نہ آئے تاہم بھوک سے مجبور ہو کر کھائے پھر گوشت اور چاول ملے، جو خوب لذیذ تھے اور پیٹ بھر کر کھائے گئے غلطی یہ ہوئی کہ اسی پر اکتفا نہ کیا گیا۔ دہی میں ملے ہوئے

سیخ پر لگے ہوئے گوشت کے ٹکڑے بھی کھائے جو سب سے زیادہ مزیدار تھے۔
اور ذراسی کھیر بھی۔ اس قدر شکم سیر ہو کر کھانا ہزاروں مرتبہ کھایا تھا مگر اب
بیماری نے اس کے ہضم کی قوت نہیں چھوڑی تھی۔ ذرا ہوا کھا کر جو ہوٹل آیا تو
سوءِ ہضم کی شکایت محسوس ہوئی۔ پلنگ پر آتے ہی لیٹ گیا۔ رات کو کچھ نہ کھایا
اور صبح کو بھی احتراز کیا۔ البتہ غسل کر کے دوپہر کو ہوا خوری کے لئے بی کے ساتھ
موٹر میں گیا اور الموڑہ کے دوست بدری دت پانڈے کے بھتیجے اور گوبند ولبھ پنت
صاحب سوراجی لیڈر نینی تال کے داماد چندردت پانڈے صاحب جو یہاں تعلیم
حاصل کر رہے ہیں ساتھ تھے۔ واپسی پر تسلی ہوئی اور پٹ نکلے۔ شب کو بخار بھی ہو گیا۔
یہ ۸ اور ۹ اکتوبر کی سرگذشت ہے۔ اس کے بعد چار پانچ دن حالت سخت خراب
رہی بالآخر (ڈاکٹر بوری) ماہر علاج قلب نے جلد سے جلد جو دن علاج کے لئے
نکال سکتے تھے ڈاکٹر دہبی کی دوستی کی وجہ سے دیا۔ اس سے پہلے ایک دن ایک
اور ماہر علاج قلب کے گھر جا کر قلب کی حرکت کا بجلی سے نقشہ کھچوایا اور قارورہ کا
امتحان کروایا لیکن جگر کی خرابی نے بیتاب کر دیا تھا۔ پٹ برابر بن رہے تھے
اور چونکہ غذا ہو نہیں رہی تھی اس لئے خلو معدہ کے باعث ان کی اور بھی
زیادتی تھی اور ان کے نکلنے میں آسانی نہ تھی۔ مجبور ہو کر معدہ کے علاج کے
ماہر کو بلایا۔ اس نے کہا کہ اصل مرض دل کا ہے اسی کا علاج معدہ اور جگر کو
درست کرے گا۔ چونکہ تم کل ڈاکٹر بوری سے علاج شروع کرا رہے ہو اس
لئے میری مداخلت بیکار ہوگی تاہم شب کو سکون معدہ اور جگر کے لئے ڈاکٹر
کریپر نے افیون کا حقنہ دو چار دن دلوایا جس سے اب نیند آنے لگی ہو دوسرے
ہی دن سے ڈاکٹر بوری کا علاج شروع ہوا اور تین دن میں انہوں نے جگر
کو درست کیا۔ قلب کی حالت کسی قدر بہتر کی اور اب ان کا علاج باقاعدہ

ہونے ہی والا تھا کہ آغا خان صاحب نے اصرار کیا کہ میرے دوست پروفیسر واکینر کو بھی دکھاؤ۔

یہ ڈاکٹر پوری سے بھی زیادہ مشہور ماہر علاج قلب ہیں مگر اب بوڑھے ہو گئے ہیں۔ ایک شفاخانہ انکے سپرد ہے۔ وہاں روزانہ جاتے ہیں مگر گھر پر کسی کا علاج نہیں کیا کرتے یہاں تک کہ ٹیلیفون کی کتاب میں سے بھی اپنا نام نکلوا دیا ہے۔ اسی باعث اُن سے رجوع نہیں کیا گیا تھا۔ آغا خاں نے اصرار کیا اور اُن کو راضی کیا مگر ان کے آنے کا چار یا پانچ دن انتظار دیکھنا پڑا اس لئے کہ وہ پیرس سے باہر گئے ہوئے تھے، مگر ان کے اسسٹنٹ ڈاکٹر ڈونزویلو جو غالباً سمرنا کے رہنے والے ہیں آئے اور آکر دل جگر اور معدہ وغیرہ کی حالت دیکھ گئے۔ پیٹ پر ورم پڑ گیا تھا پیشاب آور دوا لکھ کر دے گئے اور اب چند دن صرف یہی علاج رہا۔ بالآخر گذشتہ جمعہ کو بتاریخ ۳۱ اکتوبر پروفیسر واکینر نے خود یہاں آکر مجھے خوب غور سے دیکھا اور تجویز کیا کہ چونکہ انہیں جلد کانفرنس میں شریک ہونا ہے اس لئے دل کی اصلاح کی دوا بجائے منہ سے لینے کے پچکاری سے رگوں میں لینا چاہیئے تاکہ جلد اثر کرے چنانچہ ۱ر نومبر کو اللہ کا نام لیکر پچکاریاں کی گئیں اور کل ۵ر کو پانچ دیکر بند کی گئیں۔ اس عرصہ میں اور سب دوائیں بند کر دی گئیں البتہ شب کو سوتے وقت ایک یا ڈیڑھ بڑا چمچہ ایک خوش ذائقہ شربت کا دیا جانے لگا تاکہ علی الصبح بلا تکلف ایک یا دو اجابتیں ہو جایا کریں اور روز صبح کو نمک کا بدمزہ اور تکلیف دہ جلاب جو شملہ سے اس وقت تک روز بلاناغہ دیا جاتا رہا تھا نہ دیا جایا کرے۔ واقعی یہ شربت نہایت اچھا ثابت ہوا اور تمہاری بی بی اور میں دونوں اسی کا استعمال کرتے ہیں۔ بی بی کا قارورہ بھی امتحان کے لئے پرسوں بھیجا گیا ہے تاکہ نقرس کا علاج تجویز کیا جاسکے، چونکہ پیشاب آور دوا بھی بند کر دی گئی تھی،

اس لئے پیروں کا ورم اور بھی زیادہ ہو گیا مگر آج بچکاریاں بند کر دی گئیں اور وہ پھر جاری ہو گئی ہے روز بروز حالت بہتر ہوتی گئی مگر تین دن ہوئے، سوسج خلاف معمول دو دن سے نکل رہا تھا۔ میں بھی بی کے ساتھ موٹر میں جنگل کی ہوا کھانے چلا گیا تو معلوم ہوا کہ کس قدر کمزور ہو گیا ہوں۔ ۸ اراکتوبر سے جس کمرہ میں بند تھا۔ اس سے پہلی بار ۳ رنومبر کو نکلا تو لفٹ (LIFT) تک جانا دوبھر تھا۔ اور پھر دس پندرہ منٹ نیچے آرام کرنے کے بعد بھی ٹیکسی تک جانا مشکل تھا خیر گھنٹہ بھر جنگل میں موٹر دھوپ میں گھمائی، پھر ایک جگہ آ کر بی کو دودھ کی برف کھلوائی اور دوڈھائی گھنٹہ بعد پھر ہوٹل آ گئے۔ ڈاکٹر دیہی صاحب اتفاق سے دیکھنے آئے اور نہ پایا تو سخت ناراض ہوئے اور اس وقت معلوم ہوا کہ پچکاریوں کے زمانے میں اس کا بھی سخت پرہیز تھا کھانے کا تو پرہیز تھا ہی سوائے دودھ ڈبل روٹی اور ترکاری کے سوپ (SOUP) کے سب کچھ بند تھا۔ البتہ تین چار دن تمہاری ساتھ کی ہوئی مونگ کی دال خوب کام آئی۔ کھچڑی پکوائی جاتی تھی مگر آج تک کسی نے ایسی کھچڑی نہیں کھائی کبھی دال نہیں گلی تو کبھی چاول نہیں گلے اور گلوائے گئے تو اس قدر پانی ڈالا گیا کہ کھچڑی کا کسی کو گمان نہ ہو سکتا تھا۔ دلیا معلوم ہوتی تھی اس میں نمک کم کہ ورم نہ بڑھے اور چکنائی ندارد کہ جگر نہ بڑھے تاہم یہ سب کھانوں سے لذیذ تر معلوم ہوتی تھی، اس لئے کہ سوائے لانبے کدو کے سوپ کے کوئی چیز نہیں مل سکتی تھی۔ البتہ آلو ابلے ہوئے ہیں کر دئے جاتے تھے، جس میں لیموں اور زیتون کا تیل ڈال کر سلاد بنا لیا جاتا تھا۔ خیر یہ زمانہ بھی جوں توں گذر گیا۔

آج صبح ۹ بجے آ کر پروفیسر داکیز اور ان کے اسسٹنٹ ڈاکٹر ڈونزو نے پھر دیکھا اور کہا کہ الحمد للہ دل میں جو خرابیاں نظر آتی تھیں وہ سب دور ہو گئی ہیں۔

اور حسب قرار داد سابق اب تم کل دس بجے لندن جا سکتے ہو، سوائے پیشاب اور دوا کے اور اجابت کے لئے شربت کے بارہ دن تک کوئی دوا استعمال نہ کرنا۔ اس کے بعد دل کی دوا جو منہ سے دی جاتی تھی وہ کھایا کرنا اگر خدانخواستہ پھر کوئی سخت خرابی محسوس ہو تو پچکاریاں پھر شروع کر دینا۔ کانفرنس میں روزانہ شرکت کی غالباً ضرورت نہ پڑے نہ ہر وقت حاضری کی۔ جتنا زیادہ آرام کر سکو آرام کرنا۔ ہمیں امید ہے کہ کانفرنس میں وقتاً فوقتاً رائے بھی دے سکو گے جب ضرورت تقریر بھی کر سکو گے۔ جب اس سے فارغ ہو جاؤ تو پھر پیرس آ کر ہمارا علاج کرانا۔ انشاء اللہ ایک یا ڈیڑھ مہینہ کے علاج کے بعد قلب ایسا ہو جائے گا کہ گویا کبھی یہ مرض ہوا ہی نہ تھا۔ دوا اور غذا وغیرہ کے متعلق مفصل ہدایات وہ اسوقت ارسال کر رہے ہیں تاکہ لندن جا کر ڈاکٹر عبد الرحمٰن ان پر خود بھی عمل کر سکیں اور مجھ سے بھی عمل کراتے رہیں۔ ان کا انگریزی میں ڈاکٹر وہی ترجمہ کر دینگے۔ بیگم صاحبہ بھوپال کو راستہ میں انفلوئنزا ہو گیا۔ اسی لئے عبد الرحمٰن صاحب پیرس نہ رک سکے اگر ان کی طبیعت درست ہو گئی ہوگی تو شاید وہ آج لندن سے یہاں آ جائیں تاکہ میرے ہمراہ سفر کریں، ورنہ فرانس کی حد پر یعنی کیلے کی بندرگاہ میں زاہد آ جائیں گے اور اپنے ہمراہ ہم دونوں کو لندن لے جائینگے۔ آجکل کیلے سے ڈوور تک سمندر کا سفر تکلیف دہ ہوتا ہے جس دن شوکت صاحب لندن گئے اس دن تو سخت طوفان تھا۔ زاہد صاحب تو یہاں سے ۲۶ اکتوبر ہی کو لندن روانہ ہو گئے تھے۔ شوکت صاحب ایک ہفتہ بعد یعنی ۲ نومبر کو گئے یہاں ایرانی، افغانی اور ترکی سفراء سے ملاقات کی۔ رؤف بے حسب معمول خود یہاں تشریف لائے۔ اور گھنٹوں باتیں ہوتی رہیں۔ عدنان بے اور ان کی بیگم صاحبہ خالدہ ادیب خانم یہیں تھے۔ مگر اب لندن تشریف لے جا چکے ہیں

وہاں اُن سے ملاقات ہو گی، فتحی بے صاحب یہاں ترکی سفیر تھے مگر وہ ایک نئی سیاسی پارٹی کی صدارت کے لئے انگورہ جا چکے ہیں۔ ان کی جگہ میرے پرانے رفیق اور سچے مسلمان منیر بے صاحب ترکی سفیر ہو کر آئے ہیں۔ پہلے یہ سوئٹزرلینڈ میں تھے ان سے میری دوستی ۱۹۲۰ء میں ہوئی تھی جب کہ توفیق پاشا کی سرکردگی میں پہلا ترکی وفد صلح کے لئے آیا تھا اور شرائط صلح کو سخت تباہ کن پا کر واپس چلا گیا تھا جب مجھے .... جا کر اس وفد سے ملنا ہوتا تھا تو نماز کے لئے مصلی انہی کے ہاں سے ملتا تھا۔ انہی کے ذریعے سے ہم نے خفیہ طریقہ پر سلطان محمد وحید الدین کے پاس توفیق پاشا کی بہو اور سلطان کی لڑکی کی معرفت اپنے وفد کا خط بھجوایا تھا۔

افغانی سفیر یہاں اب تک وہی ہیں جو شاہ ولی خان کے ہمراہ یورپ آئے تھے۔ اور جنہیں منفرا سے میں اپنے ساتھ موٹر میں بٹھا کر دہلی لایا تھا تاکہ وہ اسی شام کو اپنے سسر کے ساتھ اپنی ساس سے ملنے نینی تال جا سکیں۔ گول میز کانفرنس کا کام بحمد اللہ جہاز پر اچھی طرح ہوتا رہا اور مہاراجہ صاحب الور نے اس میں بڑی مدد کی۔ شوکت صاحب اسی لئے یہاں سے ۲ تاریخ کو چلے گئے۔ آغا خاں صاحب دو دن پہلے جا چکے تھے۔ مجھ سے ان سے ٹیلیفون پر خوب باتیں ہوئیں اور ان کو متفق پایا۔ جو خبریں بعض امریکن اخبارات کے ذریعے سے یہاں سے ملیں ان سے امید ہوتی ہے کہ ہندوستان کا مطالبہ غالباً متفق ہو "خدا ہم چنیں کرد" کامیابی ہر حالت میں سخت مشکل ہے مگر اسکے بغیر ناممکن ہے۔ خدا کرے کہ مہاسبھائی ذہنیت سمندر پار جا کر بدل جائے اور ہندوستان والوں کو اپنی غلامی کا صحیح احساس ہو اور ایک دوسرے کو غلام بنانے کے خیال کو چھوڑ کر سب کو دوسروں کی غلامی سے نکالنے کی کوشش کریں خدا ہند

مسلمان دونوں کو توفیق دے کہ ایک دوسرے کے ساتھ انصاف اور رواداری کا برتاؤ کریں اور غلامی سے اتنے بیزار ہوں کہ نہ دوسروں کی غلامی قبول کریں نہ دوسروں کو غلام بنانے کی کوشش کریں۔ آمین ثم آمین۔

اب رخصت ہوتا ہوں۔ اس خط کو سب عزیز و اقارب کو رام پور میں سنا کر فوراً عرفان صاحب کے پاس بھجوا دینا کہ اسی ہفتہ خلافت میں شائع ہو جائے۔ بہتر تو یہ ہے کہ اسکی نقل دفتر خلافت کو بھجوا دی جائے اصل تم اپنے پاس رکھو۔

یہی خط نواب اسمٰعیل خان صاحب اور مولینا عبدالماجد صاحب دریا آبادی کے لئے ہے۔

سب کو سلام دعا پیار۔ طارق کو بالخصوص۔

تیرا دعاگو اور دعا طالب
محمد علی

(۲)

شاہ برطانیہ سے ملاقات

۴۹۲ مرٹن روڈ

وانڈس ورتھ

لندن ۱۲ نومبر ۱۹۳۰ء

پیاری زُہرہ۔ خداوند کریم تجھے اور طارق کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ پیرس کے خط میں جو ہوائی ڈاک سے روانہ کیا گیا تھا، میں نے اپنی صحت کی مفصل کیفیت لکھدی تھی۔ دوسرے دن خدا کے فضل و کرم سے دھوپ خوب نکلی تھی تو ہم نکل پڑے اور لندن پہنچ گئے۔ شوکت اللہ شاہ کو ہمراہ لے گئے تاکہ سمندر عبور کرتے وقت کوئی مرد شریک سفر ہو۔ راستہ خوب گذرا۔ شب کو یعنی ساڑھے چھ بجے شام کو لندن پہنچے۔ شوکت صاحب اور ناہد ملے ہم لوگ اپنی گاڑی میں جو مالکہ مکان نے کرایہ پہ دے رکھی ہے گھر پہنچے مالک مکان کا نام Mrs Mawlankar (مسز ماؤلنکر) ہے ان کے شوہر کا گذشتہ فروری ہی میں انتقال ہوا ہے پیسہ والے آدمی تھے۔ اب یہ پریشان ہو گئی ہیں۔ مکان وسط لندن سے بہت دور ہے مگر میں چونکہ بیمار ہوں اور زیادہ لوگوں کا آنا میرے لئے بُرا ہے اسلئے یہاں ان کے مکان میں ہم لوگ رہتے ہیں۔ ہر ہفتہ ۱۶ گنی یعنی کوئی ۲۰۸ روپیہ کھانے اور کرایہ کے دینے پڑتے ہیں اور ساڑھے پانچ پونڈ فی ہفتہ یعنی ۷۰ روپیہ موٹر اور شوفر کے لئے، تیل روزانہ تین چار روپیہ کا خود خریدنا پڑتا ہے اس طرح کوئی ۹۰۰ روپیہ ماہوار کا خرچ ہے۔ انگریزی گورنمنٹ ساڑھے

تین سو روپیہ ماہوار دیتی ہے اور ہندوستان کی حکومت ۵۰۰ روپیہ ماہوار دیتی ہے، کپڑوں کی دھلائی اور اوپر کا خرچ سب ملا کر اس ۵۰۰ روپیہ ماہوار میں نکل آئے گا اور غالباً بی کا آمد و رفت کا کرایہ بھی۔ مگر میرے علاج کا خرچ اور ری آنا (VEINA) جانے کا خرچ شاید نہ نکل سکے۔ ۷۰۰ روپیہ لیکر بمبئی سے چلا تھا اور ساڑھے تیرہ سو گورنمنٹ کے پاس سے پیرس میں ملے اس دو ہزار میں سے کل دو سو باقی ہیں۔ حالانکہ سب سے بڑے ڈاکٹر کا علاج آغا خاں کی بدولت ہوا۔

یہاں آتے ہی معلوم ہوا کہ بادشاہ اور ملکہ نے صبح ہی کو بلایا ہے۔ بی اور میں بڑی مشکل سے گئے۔ شوکت صاحب موٹر لے گئے تھے۔ مجبوراً کرایہ کی گاڑی میں گئے بہر حال وقت پر پہنچ گئے وہاں سے لوٹ کر گلنار اور شعیب کو نواب صاحب بھوپال کے ہاں دیکھا ان کا پتہ ....

ہے۔ بھوپال والوں کو سب کو انفلوئنزا ہو رہا تھا۔ گلنار بھی ہاری باری اس میں مبتلا ہوئی اور میری مصیبت دیکھو کہ مجھے بھی ہو گیا۔ کھانسی زکام بخار میں گرفتار رہا۔ پرسوں شب کو ۱۰۳ ڈگری بخار تھا بڑی مشکل سے کونین کھا کہ کل دوپہر کو دارالامراء میں اپنے افتتاحی جلسے میں شریک ہوا۔ وزیر ہند بہت شرافت سے پیش آیا تھا گذشتہ ہفتہ کی صبح کو خود ہی جھنڈواڑہ کے پرانے ڈپٹی کمشنر کاربٹ سے کہہ کر مجھ سے .... ہوا جب میں (اور بی) بادشاہ اور ملکہ کے سامنے گئے اور ہاتھ ملایا تو میری سخت علالت کا ذکر کیا۔ بادشاہ نے عیادت کی اور اس زمانہ کے لندن کے موسم کی شکایت کی میں نے کہا میں چھ بار آچکا ہوں۔ چار برس طالب علم رہا۔ موسم سے خوب واقف ہوں آپ اس کی معذرت نہ فرمائیے میں آج وزیر ہند سے ملنے جا رہا تھا، مگر کل خود اسی نے کانفرنس میں آکر مجھ سے کہا کہ میں نے سنا ہے

تم رات بخار میں مبتلا تھے۔ خدارا تم نہ آؤ۔ میں خود تمہارے گھر آؤں گا۔ میں نے کہا ہر یا ۹ میل دور رہتے کہا اسی قدر رانڈے یا آفس تمہارے گھر سے دور رہتے ہیں مٹا کٹا تم بیمار۔ آنا مجھے چاہیئے یا تمہیں۔ اچھا اب کانفرنس کا حال سنو۔ سب لوگ متفق ہوئے جا رہے ہیں مگر ہندو سبھا والے علیحدہ ہیں اور اب سب ان سے بیزار ہو گئے ہیں۔ ہندو مسلم فیصلہ کی کمیٹی کے صدر آغا خاں اور مسلم نمایندے سر محمد شفیع جینا اور میں تین ہیں۔ اصلی کانفرنس کا کام سینٹ جیمس پیلس میں ۱۷ نومبر کو ۱۱ بجے شروع ہوگا۔ انگریزوں پر خاصا اثر پڑا ہے۔ مرعوب ہو رہے ہیں۔ بالخصوص اس وجہ سے کہ والیان ملک اور ہم لوگ متفق ہیں۔ یہ خط نواب صاحب بھوپال کے ہاں سے لکھ رہا ہوں۔ بی اپنے گھر پر ہے۔ گلنار جانور خانہ دیکھنے گئی ہے۔ اچھا اب رخصت۔ شوکت صاحب یہاں موجود ہیں، زاہد کہیں گئے ہیں۔

سب کو دعا، سلام اور پیار۔ بالخصوص طارق کو۔

تیرا ابا

محمد علی

(۳)

زندگی کے آخری دِن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہائیڈ پارک ہوٹل
لندن

پیاری زُہرہ

خداوند کریم تجھے اور طارق کو اپنے حفظ و امان میں رکھے میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن سے اور نیز اور دوسرے ارکان کانفرنس اور گلنار وغیرہ سے قریب ہونے کے خیال سے کل سے یہاں آگیا ہوں۔ صاحب فراش ہوں۔ ٹانگیں سخت ورم کر آئی ہیں۔ چلنے پھرنے سے معذور ہوں اور لیٹ کر سونا بھی نصیب نہیں ہوتا۔ دن رات پلنگ پر بیٹھ کر گذارتا ہوں مگر دو چار دن میں انشاء اللہ یہ جبری آرام صحت بخش دے گا۔ دل کی حالت پہلے سے بہتر ہے مگر کام زیادہ پڑا۔ بالخصوص ورم والی ٹانگوں سے چلنا زیادہ پڑا یا بیٹھنا۔ لیٹنا درکار تھا۔ اب لیٹ رہا ہوں کامیابی کی امیدیں بندھ رہی ہیں۔ والیان ملک نے بہت مدد دی ہے۔ انہیں کو ہمارے ساتھ کام کرنے اور ایک مشترکہ حکومت میں شریک ہونے پر آمادہ دیکھ کر انگریزوں کی آنکھیں کھل گئیں مگر یہ سب باتیں آج مفصل انگریزی خط میں معظم کو لکھ کر ہوائی جہاز سے بھجوا رہا ہوں جو ایک ہفتہ قبل ہی پہنچ جائیگا۔

اب رخصت
تیرا پیارا باپ
محمد علی

(۴)

زندگی اور موت میں کشمکش

ہائیڈ پارک ہوٹل
۲۶ر دسمبر ۱۹۳۰ء

پیاری زُہرہ -

خداوند کریم ہم سب کو جلد اور بامُراد ملائے. خدا کو یونہی منظور تھا کہ میں آج تجھے اپنے ہاتھوں سے خط لکھوں - ورنہ گذشتہ جمعہ کو جو بڑا خط اپنے سیکرٹری سے میں ٹائپ کراتا رہا ہوں - اس کے شب کو ختم کرانے ہی میری طبیعت اتنی بگڑی کہ میں نے خود ہی بڑے ڈاکٹر یعنی ڈاکٹر ایرولکر کے دوست ڈاکٹر رائل اور تمبینہ بی کے شوہر ڈاکٹر الکلیشور یا کو بلوایا اور دونوں نے حالت اس قدر ابتر پائی کہ فوراً دو نرسوں کو بلوا بھیجا اور اگر اتنی جان بھی ہوتی کہ پاس کے ہسپتال (ST GEORGES HOSPITAL) تک جو سڑک کے کونے ہے بھیجا جا سکتا ہے تو ضرور بھیج دیا جاتا - ۱۹ کی شب کو حرارت تو صرف ۹۹ تھی مگر نبض ۱۳۵ - ۲۰ر کو بالکل بے ہوش رہا - حرارت ۱۰۰ رہی مگر نبض ۱۰۰ تک گری - پھر ۱۳۵ تک بڑھ گئی - ۲۱ر کو حرارت ۹۵ تک گر گئی مگر جلاب کے باعث جس کا ہوش مجھے صرف اجابت آنے سے ہوتا تھا، نبض ۸۰ تک گر گئی - آنکھ کھلی تو ذرا بھی ہوش نہ تھا کہ میں دو دن سے موت کے مُنہ میں تھا، نہ اس کا ہوش تھا کہ دن ہے یا رات - رات کو دن سمجھ کر لارڈ سینکی لارڈ چانسلر کو جو وزراء میں سب سے

معقول آدمی ہے اس شب کے وقت حاضری کھانے پر بڑی منت وسماجت
کی کرکے بلایا کیونکہ ریمزے میکڈانلڈ ہندو مسلم معاملات کو NURSE
سلجھانے سے قاصر تھا اور مجھے دُہن اسی کی تھی نہ معلوم کس طرح NURSE
راضی ہو گئی۔ غالباً اتنا بڑا نام سُنا تو ہیبت زدہ اور مرعوب ہو گئی۔ لارڈ سینکی
بڑا شریف بزرگ ہے سمجھ گیا اور سن چکا تھا کہ موت اور زیست کے بیچ میں ہوں
اس لئے دوسرے ہی دن صبح کو ۱۱ بجے آنے کا وعدہ کر دیا۔ وہ آگئے اور گو شوکت
صاحب نے بھی اسی وقت آنا چاہا اور میں گھبرایا کہ بات نہیں کرنے دینگے جس
سے کسی قدر ناچاقی ہوئی تاہم دس منٹ ہی میں میں نے اپنا مطلب ادا کر دیا
اور کہہ دیا کہ سارے ہندوستان کا ہندو مسلم (مسئلہ) ایک ہے قومی ہے
اور تاریخی ہے۔ صوبہ وار نہیں ہے صرف ایک اصول پر ہر جگہ طے ہوگا اور
وہ اصول یہ ہے کہ جہاں ہندو اکثریت ہو وہاں پوری قوت ہنود کو دو۔ مگر
مسلمانوں کے لئے تسمہ لگا رہنے دو لیکن جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہو پوری
قوت مسلمانوں کو دو اور تسمہ ہنود کے لئے اسی طرح لگا رہنے دو یعنی
Power of Majority خواہ ۵ یا ۶ کی ہو یا ۴۰-۴۵ کی اور
اور Protection for Minority خواہ ۴۵ کی ہو یا
۳۰ کی۔ غضب یہ ہو رہا ہے کہ سکھوں اور انگریزوں کے بہانے سے پنجاب اور
بنگال میں مسلمانوں کی مجارٹی کو مینارٹی کیا جا رہا ہے اور لطف یہ ہے کہ کل آنکھ
کھولتے ہی بیگم شاہ نواز کی ایک تحریر اسی مضمون کی پڑھی کہ پنجاب میں ایک دو کم
مسلمان کر دئے جائیں تو کیا ہرج ہے۔ یہ رحمدلی اور ملک پروری نہیں ہے
پاگل پن ہے۔ یہاں آئے ہی کیوں تھے۔ اچھا اب رخصت ہوتا ہوں۔ ۵ دن
سے برابر ترقی ہے کل ۱۳ تک ہسپتال جا کر آرام کرنے کا ارادہ ہے۔ ایک

رات کی ساری نیند اس مصیبت میں گئی کہ ۲۶ر دسمبر تک کے "خلافت" میں میری پوری تقریر کا ترجمہ نہیں شائع ہوا تھا حالانکہ ۱۲ر کی شب کو دی تھی اور اسی شب کو اصلاح کر کے بڑی مصیبت سے ہوائی جہاز کے لئے ٹکٹ خرید کر کے (مسلم اوٹ لک) Muslim Outlook لاہور کو ارسال کی تھی۔ تین گھنٹے جس مصیبت میں کاٹے تھے وہ خدا ہی جانتا ہے (اب یہ) "خلافت" کی غفلت (ہے) یا لاہور والوں کی ڈاک کی۔ خدا ہی کو اس کا پتہ ہے۔ تاہم "خلافت" والے تو دو ہفتے میں لندن کی اخباروں سے بھی لے سکتے تھے مگر فکر کسے اور عقل کس کو۔ دفتر میں عجیب لونڈہار چھوڑ کر آیا تھا۔ خدا رحم کرے۔ اچھا اب رخصت۔ اس کی بہت صاف نقل کسی سمجھدار شخص سے کرا کے عرفان صاحب بلکہ کسی اور کو بمبئی بھیج دو کہ بغیر سنسر کے دیر لگائے ہوئے فوراً طبع ہو جائے اور اصل ماجد ذوالفقار بھائی اور معظم کو دکھلاتے ہی اسمٰعیل خان صاحب کو بھیج دو۔ اور ان سے کہہ دو کہ مولانا عبدالماجد دریا آبادی کو اس ڈاک سے بھیج دیں۔ کاش کسی ترکیب سے حیات کو بھی فوراً ہی پہنچ سکتا۔ مگر اب سکریٹری کی جگہ ایک چھوڑ دو نرسیں ہیں۔ خدا معلوم مصارف کیسے ادا کرو نگا۔ بی کے لئے مجبور رہو کہ ایک علیحدہ کمرہ لیا ہے جس میں شوکت صاحب بھی آکر سو جاتے ہیں مظفر زاہد بیگ سے ملتا رہتا ہے۔

طارق کو اور تجھے پیار

تمہارا

محمد علی

خاتمہ بالخیر

زندگی کی آخری شب

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

لندن ۱۹۳۱ء

عزیزی جعفر[1] صاحب! السلام علیکم۔ میں نے دفتر کے تمام کارکنوں کے نام خطوط لکھے تھے تاکہ کسی کو شکایت باقی نہ رہے۔ آپ کا نمبر آج آیا ہے! ورنہ یہ خط میں خونِ جگر سے لکھ رہا ہوں۔ تم کو سلام کیا لکھتا۔ ہر ہفتہ تمہارا خط آتا تھا اور حالات معلوم ہوتے تھے! اوروں کو سلام لکھتا یا اُس کو جو دفتر میں بہت سے کاموں کا ذمہ دار تھا۔ آج کے خط سے تمہاری شکایت دور ہو جائیگی۔ مگر میں یہ لکھنا چاہتا ہوں کہ جب میں خلافت کے لئے خط لکھتا ہوں تو وہ خط سب خلافت کے حامیوں کے لئے ہوتا ہے۔ اب چند خطوط میرے اور آئیں گے۔ اس کے بعد میں خود بمبئی اور ہندوستان میں ہونگا! ورنہ کولہو کا بیل" پھر کام میں لگ جائیگا اور اب انشاءاللہ پہلے سے زیادہ طاقت اور کامیابی کے ساتھ۔ کیونکہ خدا بہت سے نئے کام کرنے والے پیدا کر رہا ہے۔ آج محمد علی کا جنازہ پانچ دن کفن دو زدوں کے مکان پر آرام کر کے ٹلبری بندرگاہ کو گیا اور سیدھے جہاز "ترکنڈہ" اُسکو لیکر بیت المقدس

---

[1] دفتر مرکزی خلافت کمیٹی بمبئی کے ایک ممتاز کارکن۔

کو روانہ ہوگیا۔ ۱۶ جنوری کو بیگم محمد علی، زاہد، اور میں اُسی جہاز پر مارسیلز سے روانہ ہونگے اور ۲۱ کی صبح کو پورٹ سعید پہنچیں گے۔ جہاں مصر، شام فلسطین اور عراق کے عرب بھائی اس کو مسجد اقصیٰ میں دفن کرینگے۔ میرا بھائی کہو، بیٹا کہو، سردار کہو، غلام کہو، عاشق کہو، یا معشوق، مجھ سے رخصت ہوگیا۔ اور اب میں اکیلا رہ گیا۔ بے دست و پا ہوں مگر خدا پر بھروسہ ہے اور وہ ایک محمد علی کی جگہ دین مقدس کی خدمت کے لئے ہزار محمد علی پیدا کردے گا۔ میں تم سب سے دور ہوں پھر بھی خوب جانتا ہوں۔ کہ اس موت سے مسلمان بجائے کمزور ہونے کے کمر ہمت باندھکر کھڑے ہوجائیں گے۔ خیر جو کچھ ہو۔ اسلام کا یہ مخلص سپاہی میدانِ جنگ میں ایک زبردست ڈنکے کی چوٹ مار کر سپاہی کی موت مر گیا اور اسلام کا نام کر گیا۔ تنہا اور کھیلتا دنیا سے اُٹھ گیا۔ آج دل میں صدمہ ہے۔ ہاتھ حالات لکھتے ہوئے کانپتا ہے۔ پورا قصہ بمبئی آکر سناؤنگا۔ اس وقت تک دل پر قابو پا جاؤں گا۔ آج عبارت آرائی کو دل قبول نہیں کرتا۔ پھر بھی جبر کرکے ضروری حالات لکھتا ہوں۔

محمد علی کا علاج صرف احتیاط، سکون اور پرہیز تھا۔ سب سے زیادہ آرام اور سکون کی ضرورت تھی۔ مگر وہ کہاں نصیب ہوتی۔ مسلمانوں کی موت اور زیست کا سوال تھا۔ کس طرح خاموش رہتا۔ عمر بھر کبھی احتیاط کام کے وقت کی نہ تھی اب کیا کرتا۔ اور پرہیز کون عمر بھر کرتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو قوت ۱۰ برس معمولی احتیاط کی زندگی بسر کرنے میں کام کرتی۔ اُسکو دس مہینے میں خرچ کردیا اور بی اماں مرحومہ کی طرح یہ طاقت خرچ کرکے میٹھی نیند سو گیا۔ آخری دورہ تقریباً ۲۰ دسمبر کو پڑا تھا۔ میں ۲۳ دسمبر کو آئرلینڈ ۴ دن کے لئے جانا چاہتا تھا۔ مگر اس کی وجہ سے ملتوی کردیا۔ نرسوں کے ہاتھ وہ دے دیا گیا اور ہم سب

شب و روز ہائیڈ پارک ہوٹل میں موجود رہتے تھے۔ اور میں تو وہیں سوتا تھا۔ ۴۸ گھنٹے کی کشاکش کے بعد خدا نے خطرہ سے باہر کر دیا۔ اور اب امید پڑی تھی کہ وہ کام سے باز آ جائیں گے اور خدا ان کو صحت دے گا اور وہ ہندوستان مع الخیر واپس جائیں گے۔ طبیعت اس قدر درست ہو گئی تھی کہ ۳۱ دسمبر کو گلنار بانو کی سالگرہ کے موقع پر محمد علی نے بہت سے احباب کو ہندوستانی شفیع ہوٹل کے تیار کئے ہوئے کھانے کی دعوت دی۔ آج تک کبھی کسی اولاد کی سالگرہ نہیں منائی تھی جب میں نے منع کیا تو کہا کہ "مت روکو۔ میرا چل چلاؤ کا وقت ہے۔ وہ بچی خوش ہو جائے گی"۔ میں اسی دن آئرلینڈ چلا گیا۔ کیونکہ محمد علی کی صحت اچھی تھی۔ اور وہاں جانا ضروری تھا تاکہ مقررہ ملاقاتیں ہو جائیں۔ اور آئرلینڈ کے حالات سے واقف ہو جاؤں۔ چار دن رہ کر واپس آیا! ور اتوار کی صبح کو ۶ بجے لنڈن واپس آ گیا مگر گاڑی ہی میں ۸½ بجے تک رہا۔ بیماری کی کوئی اطلاع نہیں ملی تھی اور کیسے ملتی۔ ہفتہ کے دن صبح کو ایک گھنٹہ بھر نواب عبدالقیوم سے سرحد کے معاملہ پر مفصل گفتگو کی۔ وہ خود سرحد کی کمیٹی کے ممبر تھے اور چاہتے تھے کہ سرحد کے معاملہ میں مسلمان نہایت سختی کے ساتھ کھڑے ہوں اور مطالبات میں کمی نہ کریں۔ اسکے بعد ۱½ گھنٹہ سندھ کے بارے میں سر شاہ نواز بھٹو سے گفتگو کی۔ تیسرے پہر کو بیگم عبدالعزیز صاحب لاہور سے ۲ گھنٹے مسلمان عورتوں اور اسلامی حقوق کے بارے میں باتیں ہوئیں۔ دو دن قبل تین گھنٹے متواتر سر جوفرے کاربٹ کے سامنے شارٹ ہینڈ والے کو ہندو مسلم مسئلہ پر اپنے خیالات لکھوائے اور دوسرے دن ۲½ گھنٹے خود اُس کے پروف صحیح کئے۔ پانچ بجے شام کو ہفتہ کے دن ڈاکٹر سے کہا کہ میں تھک گیا ہوں۔ ذرا آرام کر لوں۔ دو گھنٹے آرام کیا۔ جب ۷ بجے غفلت سے ہوشیار ہوئے تو دماغ درست تھا مگر زبان بند ہو گئی تھی

ڈاکٹر اُلمز کو ڈاکٹر انکلشوریا نے بلایا اور اُنہوں نے کہا کہ دماغ میں خون کی رگیں پھٹ گئی ہیں۔ اور اب کوئی اُمید نہیں ہے۔ یہ واقعہ قریب ۱۱ بجے شب کا تھا۔ سب کو پہچانتے تھے۔ سیدھی ٹانگ، سیدھے ہاتھ اور سارے جسم پر سیدھی طرف اثر تھا فالج کا۔ سا۔۲ بجے سے بالکل غافل تھے اور ۹ ½ بجے دن کے نہایت سکون کی حالت میں دنیا سے کوچ کر گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

عبدالرحمٰن صدیقی، صرف علاوہ نرس کے کمرہ میں تھے۔ اُنہوں نے سب کو آواز دی اور لوگ بھی آ گئے۔ میں انتقال کے ۱۵ منٹ بعد پہونچا اور گلنار بانو بھی تھوڑی دیر قبل۔ جن لوگوں نے ہفتہ کے روز ملاقات کی تھی اُن کو اس طرح گزر جانے کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ ساری قوت صرف کر دی تھی اور دماغ اس قدر اسراف کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

میں جب اپنی قیام گاہ پر پہونچا تو اُسی وقت صاحب خانہ نے اطلاع دی اور میں سیدھا ہوٹل آیا۔ بیگم محمد علی کی خدمات اور ہمت کا تذکرہ کرنا بیکار ہے۔ شب و روز خدمت کی۔ مظفر علی ویانا سے ملنے کو آ گئے تھے وہ اور زاہد بھی حاضر رہتے تھے۔ شعیب صاحب کو جب کام سے فرصت ملتی تھی تو وہ بھی دن میں تین چار پھیرے کرتے تھے۔ ہز ہائنس مہاراجہ الور تو اس رات بالکل نہیں سوئے۔ پانچ یا چھ مرتبہ کمرے میں دیکھنے آئے۔ اور بعض اوقات سونے کے کپڑوں میں اور ننگے پاؤں۔ اُن کو اس قدر صدمہ ہے کہ جب مجھ کو دیکھتے ہیں، رنج کی وجہ سے سلام کر کے مُنہ دوسری طرف کر لیتے ہیں۔

عزیزی۔ میں تم سے کیا کہوں۔ میں نے محمد علی کا چہرہ اس قدر خوبصورت کبھی نہیں دیکھا۔ میٹھی نیند۔ اطمینان سے جیسے کوئی سوتا ہے۔ آخری وقت میں ذرا بھی تکلیف

نہ تھی۔ سکون تھا۔ مسلمان تھا۔ مسلمان کی موت اس کفرستان میں مرا۔ اور تمام ملک والوں
سے خراجِ تحسین وصول کیا۔ خبر ہوتے ہی ہر طرف سے لوگ آنا شروع ہو گئے۔ یہاں کے
ہوٹلوں سے میت صرف رات کے ۱۲ بجے کے بعد باہر نکالی جاتی ہے۔ لندن کے تقریباً
سب ہندو اور مسلمان آنے والے آتے تھے اور زیارت کر کے چلے جاتے تھے گول
میز کے سب ارکان باری باری آتے تھے۔ سفید چادر چہرہ پر پڑی تھی۔ جب ہٹا کر
منہ کھول کر میں دیکھتا اور دکھاتا تھا تو بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی شخص آرام سے
سو رہا ہے۔ آنکھ یا چہرہ پر تکلیف کا ذرہ برابر بھی پتہ نہ تھا۔ شام ہی کو ہوٹل کے مینیجر نے
مشہور کفن تیار کرنے والے کارخانہ ملس کو بلایا جس کی منتظمہ ایک معقول عورت تھی۔ زاہد
جا کر سب جگہ دیکھ کر آئے۔ رات کے بارہ بجے موٹر کر کے اور اسٹریچر بھی اور بہت ہوشیار
اٹھانے والے احتیاط سے میت کو اٹھا کر لفٹ سے نیچے لائے اور موٹر میں رکھا۔
میں اسی موٹر میں سوار ہوا۔ نئے مکان میں رکھا۔ جہاں رات ہی کو دوا کا انجکشن دے کر
نعش کو ایسا کر دیا گیا کہ دس برس تک بھی خراب نہ ہو۔ میں اور دو مسلمان عزیز طالب علم
اسی مکان میں زمین پر سوئے۔ صبح کو عبدالرحمٰن صدیقی، مظفر اور میں نے غسلِ میت دیا۔
آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ زبان پر کلمہ طیبہ اور قرآن مجید تھا۔ اور محبت والے ہاتھ
آخری خدمت کرتے تھے۔ زاہد ٹیلیفون پر بیٹھے سب کو اطلاع دیتے تھے کہ نماز جنازہ
شام کو ۶ بجے پیڈنگٹن ٹون ہال میں ہوگی۔ جہاں ۴۰۰ یا ۵۰۰ آدمیوں کی گنجائش تھی۔
عالیشان جگہ تھی۔ تل رکھنے کو جگہ نہ تھی۔ ۵ بجے سے لوگ آنا شروع ہو گئے۔ مہاراجہ
کشمیر، نواب صاحب بھوپال، مہاراجہ بیکانیر اور تمام ارکان اور وزراء مع وزیر ہند
موجود تھے۔ جب نماز جنازہ کی موٹر آئی تو ہز ہائینس شاہ ولی خاں سفیر افغانستان،
عفیفی پاشا سفیر مصر، نوری اسفندیاری صاحب سفیر ایران، شیخ حافظ وہبہ صاحب
سفیر حجاز اور تمام مسلمان ارکان گول میز کانفرنس اور دیگر حاضرین نے کندھا دیا۔ باہر

انگریزوں کا ہجوم تھا اور اندر بھی تمام جماعتوں کے انگریز نمائندے تھے۔ ہال میں نماز ہوئی کیفن کا بکس یہاں بہت خوبصورت بناتے ہیں اور قیمتی ہوتا ہے۔ ایک چھوٹی آئینہ کی کھڑکی تھی جس میں سے چہرہ نظر آتا تھا۔ اخبار والے موجود تھے سب نے فاتحہ کے بعد زیارت کی اور ایک گھنٹہ کے بعد میت پھر قیام گاہ پر گئی۔ خوبصورت پھولوں کے ہار مہاراجہ پٹیالہ، مہاراجہ دھولپور، مہارانی کوچ بہار حیدرآباد دکن کے وزراء اور لندن کے ہندوستانی طلبہ کی طرف سے رکھے تھے۔ دولہا اچھا تھا۔ قریب میں سوتا تھا سعان اور رات تلاوت قرآن مجید ہوتی تھی۔ ۵ جنوری کو نماز جنازہ ہو گئی۔ آج صبح میت جہاز پر گئی۔ ہندوستان لاتے تھے۔ مگر فلسطین کا تذکرہ عبدالرحمٰن صدیقی صاحب نے کیا تھا۔ اور بعد کو مفتی اعظم کی دعوت اور تمام برادران وطن کی دعوت پر مسجد اقصیٰ میں دفن کا قصد کیا گیا تاکہ ہندوستان کے مسلمانوں کے تعلقات برادران عرب سے وابستہ ہو جائیں ۱۲ر کو پورٹ سعید پہونچیں گے۔ بیگم صاحبہ اور زاہد جہاز سے بعد تجہیز و تکفین بمبئی آئیں گے اور میں خشکی سے شام اور بغداد ہوتا ہوا کراچی جہاز سے پہونچوں گا۔ ہمارے عزیز دوست اور قابل فخر مجاہد رؤف بے بھی موجود تھے اور میت کو کندھا دے رہے تھے، اخبارات اور تاروں میں تمام جگہوں سے اظہار ہمدردی ہو رہا ہے۔ انشاءاللہ اس مجاہد اسلام کی موت بھی کام زندگی سے اچھا کرے گی۔ دعا فرمائیے۔ بمبئی کے تاروں سے ہمدردی کی خبر ملی۔ خدا تم کو جزائے خیر دے۔ بمبئی تو مسلمانوں کی کچھ خدمت کر گیا۔

شوکت علی

ماخوذ از سچ لکھنو

دین محمدی پریس لاہور سے طبع کرا کر پروفیسر محمد سرور نے کتاب خانہ ۲۶ بیرون لوہاری گیٹ